دین سے لادینیت تک

تحریر :۔ سید قمر حسن رضوی

پیشکش :۔ ادارہ فروغ انسانیت پاکستان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حق اور باطل کو ان کی اپنی اصلی صورتوں میں پیش کرنے والی کتاب

دین سے

لادینیت تک

تحریر:- سیّد قمر حسن رضوی

پیشکش:- ادارۂ فروغِ انسانیت پاکستان
۲۱۱/۳ لیاقت آباد کراچی

نوٹ:۔ اس تحریر سے کسی بھی مذہب یا اس کے کسی فرقے کے کسی فرد کی دل آزاری مقصود نہیں ہے۔ اس کتاب میں جو تاریخی حقائق قلم بند کئے گئے ہیں، ان کی وجہ صرف یہ ہے کہ لادینیت کے رجحان کو دلائل و براہین کے ذریعہ ختم کیا جائے اور دین اسلام کی فطری تصویر انسانوں کو دکھادی جائے۔

تعداد:۔ ایک ہزار

طبع :۔ اول

کتابت:۔ سید عمار حسین نقوی

مطبع :۔ ناظر پریس

سرورق:۔ اقتدار

صفحات:۔ ۱۴۴

طباعت:۔ آفسٹ پرنٹنگ

سالِ اشاعت:۔ رمضان المبارک ۱۳۹۷ھ مطابق ستمبر ۱۹۷۷ء

قیمت فی جلد:۔ ۷ روپے ۵۰ پیسے

ناشر:۔ ادارہ فروغ انسانیت پاکستان
۳/۲۱۱ لیاقت آباد، کراچی

کتاب ملنے کا پتہ
محفوظ بک ڈپو مارٹن روڈ کراچی
عباسی کتب خانہ جونا مارکیٹ، کراچی
رحمت اللہ بک ایجنسی موتن مارکیٹ، کراچی
حسین نیوز ایجنسی گلبرگ چوک، کراچی

فہرست مندرجات

اس کتاب کی تدوین میں جن کتب سے مدد کی گئی ان میں سے چند کتابوں کے نام یہ ہیں۔

۱۔ قرآنِ حکیم

۲۔ آیاتِ محکمات از سیّد امیر حسن صاحب رئیس اٹاوہ

۳۔ مصباح الظلم از سیّد امداد امام صاحب پٹنہ

۴۔ تاریخ اسلام از جسٹس امیر علی صاحب

۵۔ تاریخ اسلام از سیّد عین الحق صاحب

۶۔ تاریخ احمدی از احمد حسن صاحب نواب پرپاداں

۷۔ تاریخ الخلفاء از علامہ جلال الدین سیوطی صاحب
اُردو ترجمہ اقبال الدین احمد

۸۔ ہماری شہنشاہی از محمد عطاء اللہ خان عطآر (ناشر قرآن محل کراچی)

۹۔ رسوۃ الرسول از سیّد اولاد حیدر صاحب فوق بلگرامی

۱۰۔ تاریخ ائمہ از سیّد علی حیدر صاحب

۱۱۔ خلافت و ملوکیت از سیّد ابوالاعلیٰ مودودی صاحب امیر جماعتِ اسلامی

۱۲۔ سیرت النبیؐ از شبلی نعمانی صاحب

۱۳۔ ایمانِ ابو طالب از صائم چشتی صاحب

۱۴۔ صحیح بخاری اُردو ترجمہ از امجد علی صاحب و ابوالفتح صاحب وغیرہ
(ناشر قرآن محل کراچی)

۱۵۔ ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی از مناظر احسن گیلانی صاحب

۱۶۔ ابو حنیفہ شیعہ تھے از سیّد محمد مرتضیٰ صاحب نقوی

۱۷۔ اسلامی سوشلزم کیا ہے از مجتبیٰ فاروقی صاحب

۱۸۔ ارجح المطالب از عبید اللہ صاحب بسمل امرتسری

۱۹۔ معاویہ و یزید از حافظ علی بہادر صاحب

عرضِ مُدعا

ادارہ فروغِ انسانیت جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کہ یہ ادارہ بلا لحاظ مذہب و ملت کرۂ ارض پر بسنے والے تمام انسانوں کو پیغام امن دے کر اُنھیں پُرسکون زندگی بسر کرنے کی تمنا لے کر معرضِ وجود میں آیا ہے۔ اس ادارہ کے ایک رکن سید قمر حسن رضوی کی تصنیف کردہ زیرِ نظر کتاب "دین سے لادینیت تک" ادارۂ ہذا کی پہلی پیش کش ہے۔ انشاء اللہ العزیز بہ توفیقِ خداوندی ادارہ کے اور دوسرے اراکین کی گراں مایہ تصنیفات بھی وقتاً فوقتاً ہدیۂ ناظرین کی جاتی رہیں گی۔ تا اینکہ انسان حق اور باطل میں امتیاز کر کے راہِ حق اختیار کرے اور یہ دنیا گہوارۂ امن بن جائے مصنف کتاب ہذا نے اس کتاب کی پہلی بار اشاعت کے جملہ حقوق ادارۂ مذکور کو بلا کسی معاوضہ کے تفویض کر دیئے ہیں جس کے لئے ادارہ اُن کا تہہ دل سے مشکور ہے۔

علاوہ ازیں کوئی شخص یا ادارہ اس کتاب کو یا اس کے ترجمے کو خواہ وہ کسی زبان میں ہو، شائع کرنے کا مجاز نہیں ہوگا۔ ہمیں جناب سید قمر حسن صاحب رضوی کی ذاتِ گرامی سے اُمید ہے کہ وہ آئندہ بھی ادارۂ مذکور سے تعاون فرمائیں گے اور اپنی مزید تخلیقات سے انسانوں کو مستفید فرمائیں گے۔

سید تقی ہادی نقوی ایم اے

ادارہ فروغِ انسانیت پاکستان

۷۸۶
۹۲

پیش لفظ

اس مشینی دور میں جبکہ انسان خود بھی ایک مشین بن کر، اور اپنے مقصدِ حیات کو فراموش کر کے اپنا سکون برباد کر چکا ہے اور اُسے اتنی فرصت بھی نہیں ہے کہ وہ ضخیم کتابوں کا مطالعہ کر کے اپنے مقصدِ حیات کو متعین کر سکے۔ اس کے لئے مناسب ہوگا کہ اس مختصر کتاب میں سرسری طور سے انسانی تاریخ کا جائزہ لے کر کچھ حقائق کا ادراک کرے۔ اگر اس نے عقلی دلائل سے ان حقائق کو تسلیم کر کے اپنے مقصدِ حیات کو پا لیا تو اُسے وہ ذہنی جسمانی اور روحانی سکون میسّر آجائے گا جس کی اُسے تلاش ہے۔ لیکن اگر وہ ان حقائق کو بغیر کسی عقلی دلیل کے رد کر کے اُسے ماننے سے انکار کر دے تو اس پر کوئی جبر نہیں ہے۔ وہ اپنی مرضی کا مختار ہے۔ خدا سب انسانوں کو قبولِ حق کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

اس کتاب کی تدوین کے سلسلہ میں جناب علامہ طالب جوہری صاحب قبلہ اور جناب سیّد تقی ہادی صاحب نقوی ایم اے کا ممنون ہوں کہ انہوں نے خصوصی توجہ دے کر اسے قارئین کے مطالعے کے قابل بنایا۔ اس کے علاوہ اُن تمام حضرات کا بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے اپنے قیمتی اور مفید مشوروں سے میری ہمت افزائی کی۔ قارئینِ کرام سے استدعا ہے کہ اگر اس کتاب میں کچھ خامیاں نظر آئیں تو اس حقیر پُر تقصیر کی کم علمی اور بے بضاعتی پر محمول کر کے درگزر فرمائیں۔ نشر و اشاعت کے لئے ادارہ فروغِ انسانیت لائقِ صد تحسین ہے کہ اس نے اس ذمہ داری کو قبول کیا۔ فقط والسلام

احقر الزمن

سیّد قمر حسن رضوی

انتساب

میں اپنی اس حقیر پیش کش کو اللہ کے اُن بندوں کے نام معنون کرتا ہوں۔

١۔ جنھوں نے اس کرہ پر حاکمیتِ الٰہی کے قیام کی سعی فرمائی یا

٢۔ اب جو افراد قیامِ حکومتِ الٰہیہ کے لئے کوشاں ہیں یا

٣۔ جو اِس کے متمنّی ہیں۔

تقریظ

از جناب علامہ طالب جوہری صاحب قبلہ دام فیوضہم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جناب سیّد قمر حسن رضوی صاحب زاد مجدہٗ کی زیرِ نظر کتاب ایک ایسے شخص کی کاوش ہے جو مُسلم عقیدہ اور مُسلم تاریخ کو ایک غیر جانبدار مبصّر کی نگاہ سے دیکھنا چاہتا ہے۔

اس دنیا کا کوئی انسان مکمل غیر جانبداری کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ اس لئے کہ انسان کا اسلوبِ فکر جن عوامل سے تشکیل پاتا ہے، اُن میں خاندانی روایات، آبائی عقائد اور معاشرتی رسوم سرِفہرست ہیں۔ تاہم کسی مسئلہ پر مندرجہ بالا عوامل سے ہٹ کر غور و فکر کرنا ایک مثبت اور مستحسن اقدام ہے۔ اور ایک ایسی کوشش ہے جس سے صحت مند نتائج برآمد ہوسکتے ہیں۔ جناب قمر صاحب کی یہ قلمی کاوش بھی ایک ایسی ہی کوشش ہے۔ انہوں نے اپنے مطالعہ کے ذہنی ذخیرہ کو جس خوش اسلوبی اور غیر پیچیدہ طرزِ نگارش کے ساتھ سپردِ قلم کیا ہے وہ یقیناً اس قابل ہے کہ اُسے صاف ذہن اور گہری نظر کے ساتھ پڑھا جائے۔ اور اسے فہم و فکر کی میزان پر پرکھ کر قبول کرنے کی کوشش کی جائے۔ ممکن ہے کہ دورانِ مطالعہ بہت سے قارئین کو کسی واقعہ سے یا کسی واقعاتی استنباط سے اختلاف پیدا ہو، لیکن جس خلوصِ نیت اور جذبۂ طاہر کے تحت یہ تمام مواد جمع کیا گیا ہے اُس سے کسی اختلاف کی گنجائش نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس کتاب کا

مقصد نئی نسل میں پرورش پانے والے لادینی رجحانات کا ازالہ ہے اور ایک متعین شدہ صحیح نہج فکر کی طرف ہدایت کرنا ہے۔

میں نے طباعت سے قبل اپنی قلت فرصت کے باوجود اس کے مسودہ کا مطالعہ کیا اور اس کی طباعت کی تشویق کی، اس کا مقصد یہی تھا کہ جناب سیّد قمر حسن رضوی کی کوشش بارآور ہو، اور ملّت کو ان افکار سے استفادہ کا موقع نصیب ہو۔

مجھے امید ہے کہ مصنفِ مذکور کی یہ تحریر مقبول ہو گی اور صاحبانِ مطالعہ اس کی طرف توجہ دیں گے۔

طالبؔ جوہری

۱/۱۵۳۔ ا۔ ایف، شمالی ناظم آباد

کراچی

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیمِ

بابِ اوّل

سکون کی تلاش میں

تمہید مادّی ترقیوں کے باوجود نوعِ انسانی کو سکون کیوں میسر نہیں ہے ؟ جب کوئی انسان اس کا سبب معلوم کرنا چاہے گا تو اُس کو پوری تاریخ بشریت دیکھنا پڑے گی اور اِسی تلاش و جستجو میں جب وہ قرآنِ حکیم کا مطالعہ کرے گا تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ یہ کائنات جس کا نظام ایک مقرّرہ اصول کے تحت جاری و ساری ہے خود بخود نہیں پیدا ہو گئی اس کا کوئی خالق ضرور ہے۔ یہ بے شمار مخلوق جس میں انسان بھی شامل ہے بے مقصد خلق نہیں ہوئی۔ قرآنِ مجید نے غرضِ تخلیقِ کائنات عبادتِ خدا بتائی۔ جب مفہومِ عبادت پر غور کیا تو پتہ چلا کہ کسی بھی نوعِ مخلوق کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا سفر، حاکمیت الٰہی کے تحت بسر کرنا عبادت کہلاتا ہے یعنی منشائے خالق کے مطابق اپنے سفرِ حیات کو طے کرنا۔ اسی کا نام "دینِ اسلام" ہے یعنی سلامتی اور امن کا طریقۂ زندگی۔ اسی طریقۂ زندگی یعنی طریقۂ بندگی و عبادت کو بتانے اور سکھانے کے لئے اُس نے اپنے معلّم بھیجے تاکہ انسان ان کے قول کو سُن کر اور ان کے عمل کو دیکھ کر وہی طریقہ اختیار کریں جو خود اُن (انسانوں) کے لئے ہی مُفید ہے۔ چنانچہ ابو البشر حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت خاتم علیہ السلام تک جتنے بھی معلّم مقرّر ہوئے وہ سبھی ذی شرف تھے۔ اُن کے قول و عمل میں کوئی تضاد نہیں۔ بہ لحاظ علم اور بہ لحاظ کردار یہ عام انسانوں

سے بہت بلند ہیں۔

انسانی خلقت میں فجور و تقویٰ دونوں شامل ہیں جس کی بنا پر انسان کو قدم قدم پر ہدایت کی ضرورت ہے اور خدا کے فرستادہ یہ معلّم اس کی برابر ہدایت کرتے رہے لیکن انسانوں کی اکثریت نے ان ہادیانِ برحق کے احکام پر عمل نہیں کیا۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلی نافرمانی حضرت آدمؑ کے دو بیٹوں قابیل و ہابیل کے واقعہ میں نظر آتی ہے۔

اولادِ آدمؑ

حضرت ہابیل حاکمیتِ الٰہی کو تسلیم کرتے ہوئے اپنے والد کے مُطیع و فرمانبردار تھے۔ قابیل اس کے برعکس تھا۔ قابیل نے ہابیل کی عزت و اکرام پر جو اُن کو اطاعتِ خداوندی کی وجہ سے حاصل تھا حسد کیا اور نزاع پیدا کیا۔ دونوں بھائیوں نے والد کی ہدایت پر خدائی فیصلہ کے لئے اپنی اپنی قربانی خدا کے حضور پیش کرنے پر رضامند ہو گئے۔ چنانچہ دونوں نے اپنی اپنی قربانی خُدا کے حضور پیش کی۔ ہابیل کی قربانی قبول اور قابیل کی رَد کردی گئی۔ قابیل نے اس خدائی فیصلہ کو منظور نہیں کیا اور ہابیل کو قتل کر دیا۔ زمین پر اللہ کی نافرمانی اور اس کی حاکمیت سے انکار کی یہ پہلی مثال قائم ہوئی اور خوں ریزی اور قتل کی بنیاد پڑی۔

نسلِ آدم اب اور بڑھتی ہے اور حضرت نوحؑ کے زمانے تک پہنچتی ہے۔ اس دوران وہ خدا کے مقرر کئے ہوئے ہادیوں سے روگردانی کرتے ہوئے خدا کے مقابلہ میں اپنی حاکمیت پر بھروسہ کرنے لگے۔ سرداری نظام قائم کرنا شروع کر دیا جب حضرت نوح علیہ السلام اُن کی ہدایت کرتے کرتے عاجز ہو گئے تو انہوں نے خدا سے کافرین کے لئے عذاب مانگا۔ خدا نے ان سرکش انسانوں کو مہلت دینے کے لئے حضرت نوحؑ کو ایک بڑی کشتی بنانے کا حکم دیا۔ کافی عرصہ میں وہ کشتی تیار ہوئی۔ کشتی تیار ہونے کے دوران اِن انسانوں نے حضرت نوحؑ کا خوب مذاق اڑایا اور غریب و نادار عوام کو جن پر یہ حکومت کر رہے تھے ورغلا کر حضرت نوحؑ کے خلاف کر دیا تاکہ ان کے سرداری نظام میں فرق نہ پڑنے پائے چنانچہ حضرت نوحؑ کی ۹۰۰ سو سال کی تبلیغِ رسالت کا ثمر صرف ستّر یا اسّی انسان تھے جو حاکمیتِ الٰہی کو تسلیم کرتے ہوئے آپ کے کہنے سے کشتی میں سوار ہو گئے۔ لیکن آپ کا ایک بیٹا اور آپ کی بیوی آپ پر ایمان نہیں لائے اور وہ ان سرکش انسانوں کے ساتھ ہی غرقِ آب ہو گئے۔

اولادِ نوحؑ کشتی میں سوار ہو کر طوفانِ آب سے بچ جانے والے انسانوں سے دوبارہ نسلِ انسانی آگے بڑھتی ہے تا اینکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دور آتا ہے اور اس دور میں نہ صرف یہ کہ حاکمیتِ الٰہی سے انکار نظر آتا ہے بلکہ انسان خود اپنے آپ کو خدا بنا کر دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ بہت سے ابتلاء و مصائب سے گزر کر سلسلۂ تبلیغ جاری رکھتے ہیں۔ آگ میں ڈالے جاتے ہیں۔ جلا وطن ہوتے ہیں لیکن اپنے منصبِ ہدایت سے دستبردار نہیں ہوتے۔ آپ کی اتنی سعی و کاوش کے باوجود بہت تھوڑے انسان حاکمیتِ الٰہی کو قبول کرتے ہیں۔ آپ کے بھانجے حضرت لوط علیہ السلام کی پوری قوم مع ان کی بیوی کے عذابِ الٰہی سے تباہ ہو جاتی ہے صرف وہ اُن کے اہلِ خاندان اور کچھ مومن اس عذاب سے محفوظ رہتے ہیں۔

اولادِ ابراہیمؑ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تین بیٹے ہوئے۔ حضرت اسمٰعیلؑ، حضرت اسحاق علیہ السلام حضرت مدین علیہ السلام۔ حضرت مدینؑ جن کے نام سے مدین کی بستی منسوب تھی۔ کا تذکرہ قرآنِ مجید میں زیادہ نہیں ملتا۔ البتہ حضرت شعیب علیہ السلام اور ان کی دو لڑکیوں کا ذکر قرآن میں ہے۔ ممکن ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام، اولادِ ابراہیمؑ میں نسلِ مدینؑ سے ہی ہوں۔ حضرت شعیبؑ کی ایک لڑکی صفورہ کا عقد حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہوا تھا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بڑے بیٹے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اور منجھلے حضرت اسحاق علیہ السلام اور ان کی اولادوں کے تذکرہ سے پورا قرآن مزین ہے۔

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام مکہ معظمہ میں اقامت پذیر ہوتے ہیں۔ یہاں ان کی نسل پھیلتی ہے اور سوائے ایک سلسلہ کے جو حضور ختمی مرتبت تک امانتِ تبلیغ کا حامل رہا ساری نسل اسمٰعیل حاکمیتِ الٰہی سے منحرف ہو کر جہالت کی تاریکی میں بھٹک جاتی ہے اور لطف یہ کہ یہ سب خدا کا ہی نام لیتے تھے۔ خانۂ کعبہ کا طواف بھی کرتے تھے اور جوشِ عقیدت میں وقتِ طواف برہنہ ہو جانا فخر خیال کرتے تھے۔ ان میں سے ہر قبیلہ نے اپنے اپنے خدا کے بُت بنا کر کعبہ میں نصب کر رکھے تھے اور اپنے خود ساختہ طریقہ پر خدا کی ہی عبادت کرتے تھے۔

اولادِ اسحاقؑ اُدھر ملک شام میں حضرت اسحاق علیہ السلام سے نسل بڑھتی ہے ان کے ایک بیٹے حضرت یعقوب علیہ السلام اور پھر اُن کے بارہ بیٹوں کا تذکرہ قرآنِ مجید

میں بہت وضاحت سے ملتا ہے۔ اُن کے دس بیٹوں نے اپنے بھائی حضرت یوسف علیہ السلام کے نمائندۂ الٰہی ہونے کو تسلیم نہیں کیا اور بوجہ حسد اُن کو ایک سازش کے تحت باپ سے جُدا کر دیا۔ ایک عرصہ کے بعد جب حضرت یوسفؑ کو منصبِ ہدایت کے ساتھ حکومتِ دُنیا بھی مل گئی تو وہ تائب ہو گئے تھے لیکن اُن کی نسلیں ایسی حکومتوں کے ہمیشہ خلاف رہیں جو سیاستِ الٰہیہ کے تحت مبنی بر عدل ہوں جن میں کسی کے ساتھ ناانصافی نہ ہو۔ کسی کی حق تلفی نہ ہو۔ چنانچہ اپنے اقتدار کے خواہاں انسان درپردہ اور ظاہرہ طور سے بھی ایسی حکومتوں کی بیخ کنی میں مصروف رہے اور زیادہ تر دنیاوی لحاظ سے کامیاب بھی رہے۔

انسانی اقتدار کے پرستار انسانوں نے حصولِ اقتدار کے بعد حاکمیتِ الٰہی کے مبلغوں اور اُن کے پیروؤں پر ہمیشہ ظلم و ستم ڈھایا۔ اُن کو قتل کیا یا اذیت ناک سزاؤں میں مبتلا کیا۔ مگر ان مظلوموں کی مظلومی رنگ لائے بغیر نہ رہی۔ وہ ظالم بھی طرح طرح کے عذاب میں مبتلا ہو کر تباہ و برباد ہوئے۔

بنی اسرائیل

اب حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دور آتا ہے۔ اولادِ حضرت اسحاقؑ جس نے اپنے آپ کو بنی اسرائیل کے لقب سے ملقب کر لیا تھا ان کی اپنی تمرّد و سرکشی کی سزا میں قبطی ان پر مسلط ہو گئے تھے جنہوں نے ان کے لڑکوں کو حضرت موسیٰؑ کے دھوکے میں جس کی خبر ان کو اُن کے کاہنوں نے دی تھی قتل کرنا شروع کر دیا۔ اور ان کی لڑکیوں کو زندہ رکھ کر اور ان کو اپنی کنیزیں اور مردوں کو اپنا غلام بنا کر ان کو ذلّت و رسوائی کے سمندر میں ڈال دیا تھا۔ آخر خدا کو ان پر پھر رحم آیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قیادت میں انہوں نے فرعونیوں سے نجات پائی۔ فرعون اور اس کے لشکر کو اللہ نے دریائے نیل میں غرق کر دیا اور بنی اسرائیل کو ان کی سلطنت و املاک کا مالک بنا دیا۔ اب چاہئے تو یہ تھا کہ بنی اسرائیل اللہ کے اس انعام کا شکر ادا کرتے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ہدایت کے مطابق خالق کائنات کی معرفت حاصل کر کے اس کی حاکمیت کو تسلیم کرتے لیکن انہوں نے فوراً ہی حضرت موسیٰؑ و حضرت ہارونؑ کی نافرمانی کرتے ہوئے حاکمیتِ الٰہی سے فرار اختیار کرنا شروع کر دیا۔ باری تعالیٰ کی رویت یا اس کے دیدار کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اصرار ہونے لگا۔ اپنی قوم سے ستر منتخب افراد کو حضرت موسیٰؑ کے ساتھ کوہ طور پر بھیج کر خدا کے جسم و شکل کی تصدیق کرنا چاہی۔ اس میں ناکامی کے بعد سامری کے بہکانے سے انہوں نے گائے کے بچھڑے کو اپنا خدا منصوّر کر لیا

اور اس کی پرستش شروع کر دی۔ اس پر اللہ نے اپنے رسول کے ذریعہ ایک قتل کے سراغ کے سلسلہ میں انہیں جب ایک گائے ذبح کرنے کا حکم دیا تو سینکڑوں حیلوں بہانوں اور حجتوں کے بعد وہ ایک گائے ذبح کرنے پر آمادہ ہوئے درآنحالیکہ ان کا دل اس کام پر آمادہ نہیں تھا۔

جب قوم عمالقہ نے اُن پر حملہ کیا تو انہوں نے بجائے مقابلہ کرنے کے حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ تم اور تمہارا خدا اس فوج سے لڑنے جائیں ہم تو نہیں جاتے۔ لہٰذا اس حکم کی خلاف ورزی کی، سزا میں انہیں چالیس سال تک میدان تیہ میں سرگرداں رہنا پڑا۔

جب انہیں من و سلویٰ جیسی نعمتیں دی گئیں تو انہوں نے اس کے بدلے حضرت موسیٰؑ سے مسور کی دال اور پیاز وغیرہ طلب کئے۔ غرض کہ جتنی زیادہ نعمتیں اللہ نے ان کو دیں اتنی ہی زیادہ انہوں نے تمرّد و سرکشی اختیار کی اور یہ سب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں ہی ہوا۔ اُن کے بعد تو ان میں تمرّد و سرکشی اس قدر بڑھی کہ حضرت کے جانشین کو جو مامور من اللہ تھے، ہادی ماننے سے انکار کر دیا اور گروہ بندی شروع کر دی ہر گروہ اپنے آپ کو حضرت موسیٰ کا جانشین اور کتابِ خدا کا وارث سمجھنے لگا۔ اللہ کی کتاب توریت میں تحریف شروع کر دی۔ اپنے اپنے مطلب کے معنی گھڑ کر بہت تھوڑے مول پر آیاتِ الٰہی کو بیچنا شروع کر دیا۔ ہر گروہ نے اپنے آپ کو دینِ خدا کا علمبردار سمجھتے ہوئے اپنے آپ کو خدا کا محبوب اور جنّت کا حقدار ظاہر کیا۔ حضرت موسیٰؑ کی بیوی صفورہ نے ان کے جانشین یوشع بن نون سے جنگ کی جس میں ستر ہزار بنی اسرائیل مارے گئے۔

یہ بنی اسرائیل اپنے زعم باطل میں نسلی افتخار کا شکار ہو کر اپنے آپ کو عام انسانوں سے برتر خیال کرنے لگے۔ ہندوستان کی برہمنیت میں بھی یہی نقشہ نظر آتا ہے۔ عجب نہیں کہ آریوں کے نام سے جس قوم نے ہندوستان پر حملہ آور ہو کے یہاں کے قدیم باشندوں کو اپنا غلام بنا لیا تھا وہ یہی بنی اسرائیل ہوں کیونکہ گائے کی پرستش جو سامری کے گئو سالہ پرستی سے اور ہولی کی یادگار حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آگ میں ڈالے جانے کے واقعات سے ملتی جلتی ہے۔ اس بات کا بھی امکان ہے کہ بنی اسرائیل ہندوستان کی طرح ایران اور چین میں بھی پہنچ کر آباد ہو گئے ہوں کیونکہ جب نسل بڑھتی ہے تو وہ تلاش معاش میں دور دور جا کر آباد ہونے لگتی ہے اور یہ عمل آج بھی جاری ہے۔

بہرحال بنی اسرائیل کی اکثریت شام اور اُس کے اطراف میں ہی آباد رہی، ان میں جو انبیاء

مبعوث ہوتے رہے یہ اُن کی تکذیب کرتے رہے۔ حضرت شموئیل علیہ السلام کے زمانہ میں جب جالوت نے اُن پر مسلّط ہو کر عذابِ الٰہی کی صورت میں اِن کو اپنا غلام بنا لیا تو انہوں نے حضرت شموئیلؑ سے اپنے لئے ایک حاکم مقرر کرنے کی درخواست کی۔ اُنہوں نے منشائے الٰہی کے تحت طالوت کو ان کا بادشاہ بنا دیا لیکن انہوں نے حکمِ خدا کے خلاف طالوت کو اپنا بادشاہ ماننے میں حیل وحجّت کی اور ان کی غربت وافلاس کو بادشاہت کے شایانِ شان نہ سمجھا۔ اللہ نے اپنے نبی کے ذریعے ان کے اس خیالِ خام کی تردید میں ان کے علم اور طاقتِ جسمانی کو اُن کی فضیلت کا سبب بنا کر اپنے حکم کو برقرار رکھا۔ بنی اسرائیل کی اکثریت نے اس خدائی فیصلہ کو دل سے تسلیم نہیں کیا اور اس کا ثبوت انہوں نے اس طرح دیا کہ جب طالوت جالوت کے مقابلے پر لڑنے گئے تو تین سو تیرہ آدمیوں کے علاوہ پوری قوم نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ لیکن اللہ نے حضرت داوٗد کے ذریعہ جالوت کو قتل کرا کے طالوت اور اُن کی قلیل فوج کو فتح مند کیا۔ طالوت نے حضرت داوٗدؑ کی بہادری سے خوش ہو کر ان کو اپنا داماد بنا لیا اور اس طرح طالوت کے بعد حضرت داوٗدؑ وارثِ سلطنتِ ظاہری اور حضرت شموئیل کے بعد وارثِ علمِ کتاب اور مامور من اللہ ہادی بھی قرار پائے۔

حضرت داوٗد علیہ السلام چونکہ ہادی ہونے کے ساتھ حاکمِ وقت بھی تھے لہذا انہوں نے سیاستِ الٰہیہ کے تحت نظامِ حکومت کو قائم کیا۔ اپنی حدودِ مملکت میں اپنے عدل وانصاف کی وجہ سے فتنہ وفساد کو برپا نہ ہونے دیا۔ ہر لحاظ سے فلاحی ریاست کا نمونہ پیش کیا۔ آپ پر جو آسمانی کتاب نازل ہوئی اس کا نام زبور ہے۔ آپ کے بعد آپ کے فرزند حضرت سلیمان علیہ السلام نے بھی اُسی نظامِ حکومت کو برقرار رکھا، کیونکہ آپ بھی اپنے والد کی طرح حاملِ کتاب اور وارثِ سلطنت تھے۔ آپ کے انتقال کے بعد بنی اسرائیل نے اپنی وہی پرانی حرکات شروع کر دیں اور آپ کے بعد کے انبیاء کو ناقابلِ پیروی سمجھتے ہوئے اُن کے درپئے آزار رہے، اور انہیں قتل تک کرتے رہے۔ تا اینکہ حضرت عیسیٰؑ کا دور آیا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اگرچہ بنی اسرائیل ہی میں سے تھے، لیکن قدرتِ خدا سے بغیر باپ کے پیدا ہونے کی وجہ سے بنی اسرائیل نے اُن کو نمائندۂ خدا ماننے سے انکار کر دیا، اور آپ کو معاذ اللہ حضرت مریم کی ناجائز اولاد مشہور کیا۔ اُن پر اللہ کی نازل کردہ کتاب انجیل سے بھی انحراف کیا،

اُن کی تبلیغِ دین میں طرح طرح سے رکاوٹیں ڈالیں، اُن کے اوصیاء کو سخت تکالیف پہنچائیں ۔ اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ انہوں نے اپنے خیال میں حضرت عیسیٰ کو سولی پر لٹکا کر قتل کر دیا، لیکن اللہ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے آپ کو ایک وقت معینہ تک اپنی مصلحت کے تحت زندہ رکھا ہے۔ اگرچہ ہمیں ان کی زندگی کا شعور نہیں ہے ۔

بنی اسرائیل جو اپنے آپ کو یہودی بھی کہتے ہیں، جب حضرت عیسیٰؑ اور ان کے پیروؤں پر مظالم کر رہے تھے، تو قدرتی طور پر مظلوموں کے ہمدرد پیدا ہو جاتے ہیں ۔ چنانچہ حضرت عیسیٰؑ کے ماننے والے اپنے آپ کو عیسائی کہنے لگے اور اپنی تبلیغ کی وجہ سے وہ یہودیوں سے بہ لحاظ کثرتِ تعداد زیادہ ہو گئے ۔ مگر انہوں نے بھی بنی اسرائیل یا یہودیوں کی طرح حاکمیت الہٰی کے بجائے انسانی اقتدار کو قائم کرتے ہوئے بڑی بڑی سلطنتیں اور بادشاہتیں قائم کرلیں ۔ اللہ کے بندوں کو اپنا غلام بنایا۔ اللہ کی زمین پر اپنا قبضہ زیادہ سے زیادہ کرنے کی کوشش کی ۔

پوری تاریخ بشریت میں دنیا کے کسی خطہ پر آپ نظر ڈال لیں ہر جگہ حاکمیتِ الہٰی کے بجائے انسانی اقتدار کا قیام نظر آئے گا اور یہ اقتدار نہیں چاہتا کہ اللہ کی حاکمیت اس کے معلّموں کے ذریعہ عام انسانوں تک پہنچے، لہذا اُس نے کبھی اس کے بالکل مخالف ہو کر اور کبھی ان میں مل کر اصل تعلیم کو مسخ کر کے پیش کیا۔ نسل انسانی آگے بڑھتی رہی ۔ جب چاروں طرف جہالت کی تاریکی چھاگئی اور عام انسان انسانی اقتدار کے شکنجے میں بُری طرح جکڑ گئے، تو ایسے میں ریگزارِ عرب کے بنی اسمٰعیل میں اُس عظیم المرتبت الشانؐ کی ولادت ہوتی ہے، جو ساری کائنات کے لئے ہادی مقرر ہو کر آیا تھا۔

حضرت محمدؐ مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بنی اسمٰعیل کے اس سلسلہ سے تعلق رکھتے تھے جو دینِ خُدا یعنی اسلام کا امانت دار تھا، اور حامل کتاب تھا۔

ابرہہ

حضور ختمی مرتبتؐ کی ولادت کے سال، یمن کے عیسائی حکمراں ابرہہ نے خانہ کعبہ کو جو حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسمٰعیل کے زمانہ سے بنی اسمٰعیل کا جائے عبادت تھا، برباد کرنا چاہا اُس وقت حضورؐ کے دادا حضرت عبدالمطلب اولاد ابراہیمؑ و اسمٰعیل میں منصبِ ہدایت پر مامور تھے ۔ آپ کے یقینِ کامل کی وجہ سے ابرہہ کو اپنے مقصد میں ناکامی ہوئی ۔ اللہ نے ابابیلوں کے لشکر

کے ذریعہ اُس کو اور اس کی فوج کو تہس نہس کردیا۔ اور اپنے گھر کی حفاظت کی۔

جب حضورؐ نے اعلانِ نبوت کیا تو کفارِ مکہ کی طرح عیسائیوں اور یہودیوں نے بھی آپ کے نمائندۂ الٰہی ہونے کا انکار کیا، سوائے اُن حق پرست یہودیوں اور عیسائیوں کے جو تعلیمات انبیاء کے مطابق حاکمیتِ الٰہی کو انسانی اقتدار پر ترجیح دیتے تھے کہ وہ سب حضرت پر ایمان لاکر مسلمان ہوتے رہے۔

زمانۂ رسالت میں یہودیوں اور عیسائیوں نے اسلام اور بانیٔ اسلام کو کفار مکہ کی طرح ختم کرنا چاہا، لیکن انہیں کامیابی نہ ہوسکی۔

خاتم المرسلین کے انتقال کے بعد جب مسلمانوں نے تحریک اسلام کو باقاعدہ حکومت کی شکل دے کر انسانی اقتدار قائم کرلیا تو پھر عیسائیوں، یہودیوں، مسلمانوں، ایرانیوں، ہندیوں، افریقیوں اور یورپینوں وغیرہ میں مذہب کے نام پر بڑی بڑی جنگیں ہوئیں جن میں لاکھوں انسان مذہب کی آڑ میں ہوسِ اقتدار کی بھینٹ چڑھ گئے۔

زمانہ گزرتا رہا۔ نسلِ انسانی بڑھتی گئی۔ قومیں اور مذہب وجود میں آتے رہے۔ ہر قوم، مذہب کے نام پر ایک دوسرے کو اپنا غلام بناتی رہی۔ پھر یہ انسان ایک ہی قوم اور ایک ہی مذہب کے ہوکر اپنے ہی ہم مذہبوں کو قتل کرکے اور بقیہ کو اپنا غلام بناکے اپنے ہوس اقتدار کی تسکین کرتے رہے۔ انہوں نے اقتدار کی خاطر اپنے باپ، بھائی اور بیٹوں تک کو قتل کرنے سے گریز نہیں کیا۔ یہ مختلف فرقوں اور ریاستوں میں بٹ گئے۔

صلیبی جنگیں

تاریخ نے ایک دور یہ بھی دیکھا کہ عیسائیوں اور یہودیوں نے باوجود اپنے آپس کے اختلافات کے اور اسی طرح مسلمانوں نے باوجود اپنے باہمی اختلافات کے مُتحد ہوکر ایک دوسرے کے خلاف مذہب کے نام پر طویل جنگیں لڑیں، جن میں لاکھوں انسان لقمۂ اجل بنے۔ تاریخ نے اس کو صلیبی جنگوں کا نام دیا ہے۔

عیسائیوں اور مسلمانوں کی یہ مذہبی رقابت چلتی رہی جو زبردست پڑتا وہ اپنے زیردست کو تباہ و برباد کرتا۔ اپنا غلام بناتا۔ اور اس طرح اپنی انا کی تسکین کرتا۔

مشرق وسطیٰ، افریقہ، یورپ اور ہندوستان وغیرہ میں عیسائی اور مسلمان حکمران برابر ایک

دوسرے سے برسرِپیکار رہے — یہ لوگ اپنے اقتدار کے لئے کبھی وطنیت کا اور قومیت کا نعرہ لگاتے، کبھی مذہب کا نام لے کر لڑتے —

برطانیہ عیسائیوں میں برطانوی قوم اور دوسری عیسائی قوموں کے مقابلہ میں زیادہ چالاک اور عیاّر تھی — اس نے رفتہ رفتہ، چین و ہندوستان، ایران و عرب، افریقہ اور آسٹریلیا اور پھر امریکہ پر اپنا اقتدار قائم کرلیا — اپنی حدودِ سلطنت اتنی وسیع کرلیں کہ مشہور تھا کہ اُس کی سلطنت میں سورج غروب نہیں ہوتا — انگریزوں نے اپنے دورِ اقتدار میں اپنے مقبوضہ ممالک کے اُن تمام حکمرانوں کو خواہ وہ کسی مذہب و ملّت کے ہوں اپنی جگہ برقرار رکھا — جو اُن کی مرضی کے مطابق چلے — لیکن اُن حکمرانوں کو ختم کردیا، جو اُن کے پنجۂ اقتدار سے نکلنا چاہتے تھے — ہندوستان میں سراج الدولہ حیدرعلی، ٹیپو سلطان، واجد علی شاہ، شاہِ اودھ اور بہادر شاہ کی مثال کافی ہے — پھر انہوں نے ہندوستان پر مکمل قبضہ کرلیا، لیکن ریاستیں پھر بھی باقی رکھیں جو انہیں اپنی حکمرانی میں مدد پہنچاتی رہیں — اسی طرح دوسری عیسائی قومیں بھی دُنیا کے اُن ممالک میں جہاں جہاں انگریز قابض تھے، کسی نہ کسی جگہ اپنا اقتدار بحال کئے رہیں —

جمہوریت یورپ میں جوں جوں تعلیم کا چرچا بڑھتا رہا — عوام الناس شخصی اقتدار سے بیزار ہونے لگے اور انہوں نے شخصی حکومت کے بجائے جمہوری حکومت کے قیام کی تدبیریں شروع کردیں — سب سے پہلے فرانس میں جان جیکس روسو نامی شخص نے موجودہ نظریۂ جمہوریت پیش کیا — لوگوں نے شخصی اقتدار سے نکلنے کے لئے اس نظریۂ حیات کو نعمت غیر مترقبہ خیال کیا — اِس کو انقلابِ فرانس کے نام سے یاد کیا جاتا ہے —

اس کے بعد امریکہ میں عیسائیوں کی مختلف قومیتوں نے برطانوی تسلّط سے نکلنے کے لئے جدوجہد شروع کی اور اب سے تقریباً دوسو سال قبل وہ جارج واشنگٹن کی قیادت میں دنیا کے سب سے پہلے موجودہ جمہوری نظام کو قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے —

۱۸۵۷ء میں ہندوستانی مسلمانوں اور ہندوؤں نے بھی برطانوی تسلّط سے آزادی حاصل کرنے کے لئے جدوجہد شروع کی لیکن انگریزوں نے اپنی چالاکی سے اس کو ناکام بنادیا — انگریزوں نے اس کا نام غدر اور ہندوستانیوں نے اِسے جنگِ آزادی کا نام دیا —

اسی دوران جرمن قوم کے ایک فرد لوتھر نے اپنے ساتھیوں کالون اور ناکس کی مدد سے رومن کیتھولک عیسائی فرقہ کے خلاف پروٹسٹنٹ فرقہ کی بنیاد ڈالی جو بالآخر برطانیہ میں خوب پھولی پھلی اور آج بھی وہاں ان کا سب سے بڑا مذہبی پیشوا آرک بشپ آف کینٹر بری۔ چرچ آف انگلینڈ کا نگراں ہے۔ رومن کیتھولک فرقہ کا صدر مقام ویٹیکن اٹلی میں ہے جہاں سے ان کے مذہبی پیشوا پوپ دنیا بھر کے رومن کیتھولک عیسائیوں کی رہنمائی کرتے ہیں۔

یہ دونوں بڑے عیسائی فرقے اور ان کی متعدد شاخیں اگرچہ آپس میں ایک دوسرے سے لڑتی رہیں۔ لیکن دوسروں پر حکومت کرنے کے لحاظ سے ان کے نظریات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ شخصی اقتدار پھر بھی اُن کا مطمع نظر رہا۔

زمانہ آگے بڑھا۔ سائنسی علوم نے ترقی کی یورپ اور امریکہ میں مقابلۂ علم ہوتا رہا اور پھر برطانوی اقتدار کو زوال ہوا، اور اس کی جگہ امریکہ نے اپنے اقتدار کو مستحکم کرنا شروع کیا۔ بہت سی جنگیں ہوئیں جن میں کروڑوں انسان لقمۂ اجل بنے۔

سوشلزم

ان تمام عیسائی، مسلمان اور دیگر مذاہب کے حکمرانوں کے جذبۂ حکمرانی اور ان کی اپنی ذاتی عیش کوشیوں اور مذہب کو غلط طور پر استعمال کرنے کی وجہ سے تقریباً ڈیڑھ سو سال قبل ایک شخص کارل مارکس نے ایک نئی تحریک سوشل ازم کے نام سے دنیا کے سامنے پیش کی، جس کا لبِ لباب عوام کی آمریت قرار دے کر معاشی طور سے ہر انسان کو روٹی کپڑا اور مکان وغیرہ مہیا کرنا تھا۔ عوام الناس جو شخصی اقتدار کی چکی میں پس کر بھوک، افلاس، بیماری اور جہالت کا شکار ہو رہے تھے اس تحریک سے بہت متاثر ہوئے۔

روس

اس تحریک کو لینن اور ٹراٹسکی نے نہایت کامیابی سے چلا کر روس کے عیسائی حکمران زار کا تختہ الٹ کر بالشویک حکومت قائم کر دی۔ لینن کے بعد اسٹالن نے ہزاروں مخالفین کو قتل کرا کے اس نظام کو مستحکم کیا۔

چین

اُدھر چین میں آنجہانی ماؤزے تنگ اور اُن کے ساتھیوں نے چین کی مستبد حکومت جو امریکنوں کے زیر اثر تھی، کے خلاف جدوجہد شروع کی۔ شدید مصائب اٹھانے کے بعد بالآخر وہ بھی سامراجی چنگل سے نکل کر اور کارل مارکس کے نظریۂ حیات پر

عمل پیرا ہو کر سوشلسٹ حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

پاک و ہند ادھر ہندوستان میں ہندوستانیوں نے انگریزوں کے خلاف اپنی کوششوں تیز کر دیا اور بالآخر ہندوستان کی تقسیم کے ساتھ ہندوؤں نے بھارت اور مسلمانوں نے پاکستان حاصل کر کے اپنے آپ کو برطانوی تسلّط سے آزاد کرا لیا لیکن اس طرح بہت سے ممالک برطانوی اقتدار سے تو نکل گئے، لیکن اُن پر معاشی اور اقتصادی طور پر امریکہ نے اپنا تسلّط قائم کر لیا۔

اسرائیل اب سے کچھ عرصہ قبل امریکی سیاستدانوں نے جن پر یہودی سرمایہ داروں کا کافی اثر ہے فلسطین میں ایک یہودی ریاست قائم کرا دی ہے، جو اسرائیلی ریاست کے نام سے موسوم ہے — یہ بنی اسرائیل امریکہ کی پشت پناہی سے مسلمانوں کے قلب میں خنجر گھونپ رہے ہیں۔ امریکہ کی شہ پر اُنہوں نے مسلمانوں کے بہت سے علاقہ پر قبضہ کر لیا ہے، اور مزید قبضہ کرنے کی فکر ہے۔

یہ یہودی جو ختم المرسلین کے بعد دنیا کے کسی حصہ میں اپنی حکومت نہ بنا سکے تھے اب مکّہ مدینہ پر حکومت کے خواب دیکھ رہے ہیں — یہ لوگ اپنی تجارت اور سودی کاروبار کی وجہ سے دُنیا کے مالدار ترین لوگ شمار ہوتے ہیں، اکثر ممالک کی سیاست پر چھائے ہوئے ہیں — اگرچہ ہٹلر نے اِن کو جرمنی سے اور اسٹالن نے روس سے نکال باہر کیا تھا۔ مگر امریکہ میں یہ خوب پھولے پھلے، وہاں بڑی بڑی صنعتوں پر اِن کا قبضہ ہے اور دنیا کے ہر خطہ میں ان کا کاروبار پھیلا ہوا ہے — یہ اپنی پوری قوت سے مسلمانوں اور سوشلسٹوں کو مٹانے کے درپے ہیں، اور اپنے سرمایہ دارانہ نظام کو قائم رکھنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں — دوسری طرف سوشلسٹ خدا کے وجود کے منکر ہو کر تمام مذاہبِ عالم کے خلاف صف آرا ہیں۔

اولادِ آدمؑ و نوحؑ اور اولادِ ابراہیمؑ میں اولادِ اسحاقؑ یعنی بنی اسرائیل کے حالات کے سرسری اور مختصر جائزے کے بعد اب ذرا بنی اسمٰعیل کی تاریخ پر بھی سرسری نظر ڈال لیجئے۔

باب دوم

نشانِ منزل

بنی اسمٰعیل حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے بعد اُن کی نسل میں حضور سرورِ کائنات ؐ تک بظاہر کوئی نبی یا پیغمبر نہیں ہوا، البتہ ایک سلسلۂ اوصیاء برابر چلتا رہا، جو دینِ ابراہیمی پر عمل پیرا ہو کر نہ صرف بُت پرستی سے مجتنب رہا، بلکہ اپنے قول و عمل سے اولادِ اسمٰعیل کو خدا کی حاکمیت قبول کرنے کی تبلیغ کرتا رہا۔ لیکن بنی اسمٰعیل کے تھوڑے افراد کے علاوہ اکثریت نے حاکمیتِ الٰہی کو تسلیم نہیں کیا، وہ مختلف قبیلوں میں تقسیم ہو گئے۔ ہر قبیلہ نے اپنے اپنے خُدا بتوں کی شکل میں بنا کر خانۂ کعبہ میں نصب کر دیئے، اور اُن کی پرستش شروع کر دی، اس کے باوجود وہ مشترکہ طور پر ایک بڑے خدا کے وجود کے بھی قائل رہے۔ طوافِ خانۂ کعبہ جو سنتِ ابراہیمی تھی اُس پر بھی عامل رہے۔ اپنے طور پر حج بھی کرتے تھے۔ اور ساتھ ہی ساتھ ہر قسم کی بدکرداریوں میں بھی درجۂ کمال تک پہنچ چکے تھے۔ سرداری نظام ان میں جاری تھا، ہر قبیلہ کا ایک سردار ہوتا تھا۔ انسانوں کو غلام بنانا باعثِ فخر خیال کیا جاتا تھا۔ ایک قبیلہ دوسرے قبیلے سے نسلاً بعد نسلاً لڑنے کو اچھی صفت شمار کرتا تھا۔

بنی ہاشم ان تمام عرب قبائل میں دو قبیلے بہت مشہور ہوئے۔ ایک بنی ہاشم اور دوسرے

بنی اُمیہ، یہ دونوں اگرچہ ایک دادا کی اولاد سے تھے مگر بہ لحاظ کردار ان میں زمین و آسمان کا فرق تھا، دونوں ایک دوسرے کی ضد تھے ــ عام طور سے بنی ہاشم اگر اخلاقِ حسنہ کا نمونہ تھے تو بنی اُمیہ اخلاقِ رذیلہ کا پورا پورا نشان تھے ــ اور انھیں باتوں کی وجہ سے اِن دونوں میں اکثر چشمک ہوتی رہتی تھی ــ اچھے عادات کی وجہ سے لوگ بنی ہاشم سے محبت کرنے کے ساتھ اُن کی عزت و تکریم کرتے تھے ــ بنی اُمیہ سے اُن کے بُرے خصائل کی وجہ سے خوف کھاتے تھے، اُن کی طاقت کی وجہ سے اُن کے سامنے سر تو نہیں اٹھاتے تھے، لیکن فطری طور سے اُن سے نفرت ہی کرتے تھے ــ

بعثتِ ختمی مرتبت

بنی اُمیہ کا بنی ہاشم کی اس عظمت سے حسد کرنا اور اُن کے درپئے آزار رہنا تمام کتبِ تواریخ میں مندرج ہے ــ اِن حالات میں حضور ختم المرسلینؐ قبیلہ بنی ہاشم کو اپنے ورودِ پُر نور سے اور زیادہ صاحبِ کرامت و عظمت بنا دیتے ہیں ــ آپ کا بچپن اور جوانی کا زمانہ حضرت عبد المطلب اور ان کے بعد حضرت ابو طالب کے سایۂ عاطفت میں نہایت سکون و اطمینان سے گذرا ــ اعلانِ نبوت سے قبل آپ کے کردار و فضائل کی وجہ سے تمام اہلِ مکّہ آپ کو صادق و امین کے لقب سے پکارتے تھے ــ

لیکن جیسے ہی آپ نے اعلانِ نبوت کیا اور اللہ کی حاکمیت منوانے کی تبلیغ کی تو سارے عرب نے عموماً اور بنی امیہ نے خصوصاً آپ کی مخالفت کی، جتنی بھی تکالیف وہ دے سکتے تھے دیں اور بالآخر انھوں نے حضور اور حضور پر ایمان لانے والوں کو مکّہ سے ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا ــ

ہجرت

نبوت کے اعلان کے بعد تیرہ سالہ مکّی زندگی میں تھوڑے لوگوں کے علاوہ اکثریت نے حضورؐ کو اللہ کا نمائندہ تسلیم نہیں کیا اور حاکمیت الٰہی تسلیم کرنے کے بجائے خود حضورؐ کے قتل کر دینے کے منصوبے بنائے لیکن حضرت ابو طالب اور حضرت خدیجہ کی زندگی تک ان کو کوئی کامیابی نہیں ہوئی ــ ان دونوں محسنانِ اسلام کے انتقال کے بعد کفارِ مکّہ نے ابوسفیان وغیرہ کی سرکردگی میں ایک منصوبے کے تحت آپ کو شہید کر دینا چاہا، لیکن اللہ نے اپنے رسولؐ کو ان کے ناپاک ارادوں سے مطلع کرتے ہوئے آپ کو ہجرت کا حکم دے دیا ــ ہجرت کے بعد آپ مدینہ میں قیام پذیر ہوئے ــ یہاں پر بہ نسبت مکّہ کے بہت زیادہ تعداد میں لوگ مسلمان ہونا شروع ہو گئے ــ کفّارِ مکّہ

کو جب یہ خبر پہنچی تو انہوں نے مدینہ میں بھی حضورؐ کو چین سے نہیں بیٹھنے دیا۔ جنگ بدر، احد، خیبر و خندق تا حنین اس کی گواہ ہیں۔ کفّارِ مکّہ نے مدینہ کے یہودیوں سے بھی گٹھ جوڑ کر لیا، اور یوں یہ سب یعنی بنی اسرائیل اور بنی اسمٰعیل مل کر اسلام اور بانیٔ اسلام کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ اِن تمام جنگوں میں جو دفاعی تھیں، اسلام کو فتح ہوئی اور ان فتوحات کا سہرا آل عبدالمطلب اور آلِ ابوطالب کے سر رہا، البتہ کچھ انصار و مہاجرین کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت علیؑ کی تلوار نے اسلام کے دشمنوں کا ایسا صفایا کیا کہ بڑے بڑے سردارانِ قریش کے سر یا تو جسموں سے جُدا ہو گئے یا جھک گئے، اب چونکہ مسلمانوں کی تعداد بھی کچھ زیادہ بڑھ رہی تھی اور کفار کے حوصلے بھی پست ہو گئے تھے کہ ایسے میں حضورؐ نے ۶ھ میں خانۂ کعبہ کے طواف کا ارادہ کیا۔ تقریباً ۱۴۰۰ سو مسلمانوں کو ساتھ لے کر آپ عازمِ مکّہ ہوئے۔

صلحِ حدیبیہ

مکّہ کے قریب کفّار قریش نے مسلمانوں کی مزاحمت کی اور طواف خانۂ کعبہ کی اجازت نہ دی۔ بالآخر ایک صلح نامہ جو صلحِ حدیبیہ کے نام سے مشہور ہے مسلمانوں اور کفار کے درمیان طے پا کر لکھا گیا۔ اس موقعہ پر ایک خاص بات یہ ہوئی کہ کفار نے اس تحریر میں سے جو حضرت علیؑ نے لکھی تھی لفظ رسول اللہؐ کو حذف کرا دیا۔ انہوں نے لفظ اللہ پر اعتراض اس لئے نہیں کیا کہ وہ اس کو تو مانتے تھے لیکن اللہ کے رسولؐ کو اس کا نمائندہ نہیں مانتے تھے۔ صلح نامہ کی شرائط بظاہر کفّار کے حق میں تھیں جن پر بعض صحابۂ رسول کو سخت اختلاف تھا اور بعض کو تو آپ کی رسالت میں ہی ایسا شک ہوا جو اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

اس صلح نامہ کی رُو سے حضورؐ بغیر طواف کئے مدینہ واپس آ گئے اور تبلیغ اسلام زور شور سے شروع ہو گئی۔ بہت سے عرب قبائل اور کئی عیسائی حکمرانوں نے دعوتِ اسلام قبول کر کے اسلام اختیار کر لیا۔

فتح مکّہ

۸ھ میں کفّار مکّہ نے صلح نامہ حدیبیہ کی خلاف ورزی کی۔ رسول اللہؐ نے تقریباً ایک لاکھ مسلمانوں کو ساتھ لے کر کفّار مکّہ کی سرزنش کے لئے مکّہ کا رُخ کیا۔ سردارِ قریش ابوسفیان نے اس عظیم لشکر سے مرعوب ہو کر اسلام قبول کر لیا۔ اور اس کے ساتھ ہی تمام کفّار مکّہ ایک دم مسلمان ہو گئے۔ رحمت اللعالمین نے سب کو معاف کر دیا۔ کعبہ کو بتوں سے

حضرت علیؑ کے ساتھ مل کر پاک کیا۔ اس کے بعد اللہ کے دین میں لوگ فوج در فوج داخل ہونے گئے۔ سارے عرب میں اب اسلام ہی اسلام تھا۔ بظاہر کفر نظر نہیں آتا تھا۔ لیکن فطری طور سے کوئی انسان اپنے دین کو یوں آسانی سے نہیں بدل دیتا البتہ اگر اُسے کسی مصلحت کی بنا پر ایسا کرنا پڑے تو وہ اور بات ہے۔ جب تک کوئی دین دل سے قبول نہیں کیا جائے گا تو صرف زبانی نام لینے سے اُس کی کوئی اہمیت نہ ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ جب اعرابی حضورؐ کے پاس آکر اپنے ایمان کا اظہار کرتے تھے تو اللہ کو سورۂ حُجرات میں اُن کے ایمان کی پوری وضاحت کرنا پڑی سردست میں صرف ایک آیت پر اکتفا کرتا ہوں۔ سورۂ حجرات آیت ۱۴ ؁ قالت الاعراب .... غفور رحیم ؁

ترجمہ:۔ یہ اعرابی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے (اے رسول) کہدو کہ تم ایمان نہیں لائے بلکہ یوں کہو کہ اسلام لائے کیونکہ ایمان تو تمہارے قلوب میں داخل ہی نہیں ہوا۔ اگر تم خدا کی اور اُس کے رسول کی فرماں برداری کرو گے تو خدا تمہارے اعمال میں سے کچھ کم نہیں کرے گا۔ بے شک خدا بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔

اُن کے بظاہر اسلام لانے کا ثبوت جنگ حنین کے موقعہ پر ہی مل گیا۔ جبکہ ابوسفیان اور اُن کے ساتھی بجائے رسولؐ کے ساتھ میں ہو کر لڑنے کے دور کھڑے لڑائی کا تماشہ دیکھ رہے تھے اور جب مسلمانوں کی شکست کے آثار دیکھتے تو خوش ہوتے تھے، لیکن اللہ نے اپنی مدد بھیج کر جنگ کا پانسہ رسولؐ کے حق میں پلٹ دیا اور اِن زبانی اسلام لانے والوں کی آرزو پوری نہ ہو سکی۔

حج آخر

۱۰ھ میں حضورؐ آخری حج پر جانے کا اعلان کرتے ہیں۔ ایک لاکھ سے زیادہ صحابہ آپ کے ہمراہ حج کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔ حضورؐ میدانِ عرفات میں ایک مشہور خطبہ حجۃ الوداع ارشاد فرماتے ہیں۔ یہ خطبہ پوری نوعِ انسانی کے لئے ایک مکمل دستورِ حیات ہے۔ اگر اس پر عمل کر لیا جائے تو پوری نسلِ انسانی امن وسکون سے زندگی بسر کر سکتی ہے۔ فتنہ وفساد کا نام ونشان بھی نہیں رہے گا۔

نصب امام

اسی دورانِ قیامِ مکہ میں سورۂ الم نشرح نازل ہوتی ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ "اے رسول کیا ہم نے تمہارے سینے کو کشادہ نہیں کیا۔ کیا ہم نے تمہارے اس بوجھ کو ہلکا نہیں کر دیا جس نے تمہاری کمر توڑ رکھی تھی ؁ پس ہر مشکل کے بعد آسانی ہے بہ تحقیق ہر پریشانی

کے ابدر اختت ہے۔ پس جب تم (حج سے) فارغ ہو جاؤ تو اپنا جانشین مقرر کر دو اور اپنے رب کی طرف رغبت اختیار کرو۔" حضور سرورِ کائنات حج سے فارغ ہو کر جب میدانِ غدیر خم میں پہنچتے ہیں تو آیۂ بلغ نازل ہوتی ہے جس کا ترجمہ یہ ہے ۔ "اے رسول اُس امر کی تبلیغ کر دو جو تم پر نازل کیا گیا ہے ۔ اور اگر تم نے یہ فعل نہیں کیا تو گویا کوئی کارِ رسالت ہی انجام نہیں دیا اور اللہ تمہیں آدمیوں کی دشمنی سے محفوظ رکھے گا بے شک اللہ کافروں کی ہدایت نہیں کرتا۔" (سورۂ مائدہ کی آیت ۶۷) ۔ اس آیت کے نزول کے بعد آپ نے ایک لاکھ سے زیادہ صحابہ کے مجمع میں کجاووں کا منبر بنا کر ایک فصیح و بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا اور تمام مجمع سے اپنی ۲۳ سالہ کارِ تبلیغ کو بطریقِ احسن ادا کرنے کا اقرار لیا ۔ اور ساتھ ساتھ یہ بھی اقرار لیا کہ نفسِ رسولؐ تمام مومنوں کے نفوس سے اولیٰ ہے ۔ اس کے بعد حضرت علیؑ کو اپنے ہاتھ سے بلند کر کے اور تمام حاضرین کو پہچنوا کر آپ نے اپنا یہ مشہور جملہ ارشاد فرمایا کہ "من کنتُ مولاہُ فھٰذا علیٌ مولاہُ" ۔ یعنی جس کا میں مولا ہوں اس کے یہ علی مولا ہیں ۔ اس طرح حضورؐ نے بحکمِ خدا اپنا جانشین مقرر کر دیا ۔ اس کے فوراً بعد اللہ نے سورہ مائدہ کی آیت ۳ کے ذریعہ اس جانشینی کی توثیق کر دی ٥ اَلْیَوْمَ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ رحیم ٥

ترجمہ :۔ آج کے دن میں نے تمہارے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لئے دینِ اسلام کو پسند کر لیا ۔ پس جو شخص مجبور ہو جائے اور گناہ کی طرف مائل نہ ہو تو بے شک خدا بڑا بخشنے والا مہربان ہے ۔

حضرت علیؑ کی اس جانشینی اور اس کی توثیق میں اللہ کے اکمالِ دین اور اتمامِ نعمت اور دینِ اسلام سے رضامندی کی سند دینے کے بعد تمام حاضرین نے رسولِ خداؐ اور علی مرتضیٰؑ کو مبارکباد دی سوائے چند مسلمانوں کے جن میں حارث بن نعمان فہری کا مشہور واقعہ ہے کہ اس نے رسول اللہؐ کے رُو برُو حضرت علیؑ کے امام مامور من اللہ ہونے سے انکار کیا تھا اور اپنے جھوٹا ثابت ہونے کے لئے خُدا سے عذاب کا طالب ہوا تھا ۔ چنانچہ وہ اُسی وقت آسمانی پتھر کے عذاب سے معذب ہو کر ہلاک ہو گیا ۔ سورۂ معارج کی پہلی آیت کی صرف تفسیر ثعلبی ہی ملاحظہ کر لی جائے تو حقیقتِ حال آشکار ہو جائے گی ۔ اس کے علاوہ اگرچہ اور دوسرے لوگوں نے بظاہر مخالفت نہیں کی لیکن وہ اس خدائی فیصلہ کے سخت خلاف تھے ۔

قاتلانہ حملہ

چنانچہ غدیرخم سے واپسی پر، مدینہ کے سفر کے دوران جب رسول اللہؐ نے ایک گھاٹی میں پڑاؤ کیا تو رات کی تاریکی میں کچھ مسلمانوں نے رسول خداؐ اور حضرت علیؑ پر قاتلانہ حملہ کرنے کی کوشش کی۔ ان لوگوں نے منہ پر ڈھاٹے باندھ لئے تھے تاکہ پہچانے نہ جا سکیں۔ لیکن حضورؐ کے ایک جاں نثار صحابی حضرت حذیفہ یمانی کی مداخلت نے اس منصوبہ کو ناکام بنا دیا۔

رسول اللہ پر پہلا قاتلانہ منصوبہ شبِ ہجرت کفارِ مکہ نے بنایا تھا اور یہ دوسرا قاتلانہ منصوبہ مسلمانوں کی طرف سے تھا۔ مگر اللہ نے دونوں منصوبے ناکام بنا کر اپنے رسولؐ کی حفاظت کی۔ اگرچہ مورخین نے اس دوسرے قاتلانہ حملہ کرنے والوں کے نام نہیں بتائے لیکن اس حملہ سے یہ تو ظاہر ہو گیا کہ ان اسلام لانے والوں میں سے ایک گروہ ضرور ایسا تھا جو دل سے حاکمیتِ الٰہی کو تسلیم نہیں کرتا تھا اور نہ اس کے رسولؐ کو اس کا نمائندہ سمجھتا تھا۔

بہر حال رسولِ مقبول بحفاظت مدینہ واپس آجاتے ہیں۔ کچھ دن بعد آپ علیل ہو جاتے ہیں۔ جب علالت طول پکڑتی ہے تو اسی دوران شام کے علاقے کے عیسائیوں کے حملہ کی تیاری کی خبر ملتی ہے، چنانچہ آپ ایک لشکر اُسامہ بن زید بن حارثہ کی ماتحتی میں ترتیب دے کر مسلمانوں کو شام کی طرف جانے کا تاکیدی حکم دیتے ہیں۔ حضرت اسامہ مدینہ سے باہر لشکر جمع کرنے میں مصروف ہوتے ہیں۔ بہت سے مسلمان اس لشکر میں شامل بھی ہو جاتے ہیں لیکن صحابہ کبار کی اکثریت محبتِ رسولؐ کی وجہ سے رسول اللہ کو اس شدید حالتِ مرض میں چھوڑنا گوارا نہیں کرتی۔ حضورؐ کو جب یہ معلوم ہوتا ہے تو آپ سخت ناراض ہوتے ہیں۔ اور مہم پر نہ جانے والوں کو مستوجب لعنتِ خدا قرار دیتے ہیں۔ اس پر بھی جب لوگ نہیں جاتے تو روانگی لشکر کا معاملہ معرضِ التوا میں پڑ جاتا ہے۔

رحلتِ رسولؐ

اب رسول اللہ شدتِ مرض میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اصحابِ باوفا اور بنی ہاشم و اہلبیتِ رسولؐ بارگاہِ رسالت میں آپ کی تیمار داری اور عبادت کے لئے حاضر ہیں کہ ایسے میں حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ قلم اور کاغذ لے آؤ تاکہ میں تمہیں وہ لکھ دوں کہ جس سے تم میرے بعد گمراہ نہ ہو گے۔ بنی ہاشم نے حضورؐ کے اس حکم کی تعمیل میں کاغذ قلم لا کر دینا چاہا۔ کچھ صحابہ کبار نے محبت رسولؐ کی وجہ سے کہ لکھنے لکھوانے میں تکلیف ہوگی، اس تحریر کے لکھنے

کی مخالفت کی ۔ اس بحث و تکرار میں جب شور بلند ہوا تو حضورؐ نے سب کو اپنے پاس سے ہٹ جانے کا حکم دیا اور فرمایا کہ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ رسول کی بارگاہ میں آوازیں بلند کرنا حبط عمل کا باعث ہو جاتا ہے ۔ چنانچہ سب لوگ اس حکم کی تعمیل کرتے ہوئے بارگاہِ نبوت سے چلے گئے صرف اُم المومنین حضرت عائشہ، حضرت سیدہ اور حضرت علی رہ گئے ۔ رسول اللہ تحریری طور پر کسی کو اپنا جانشین مقرر نہ کر سکے ۔ اور اسی حالت میں آپ نے اپنے رب سے ملاقات کے لئے اس جسد ظاہری سے مفارقت اختیار کر لی۔

تدفین رسولؐ

نعش اقدس ابھی گھر میں ہی تھی کہ بجز بنی ہاشم صحابہ کبار کے دو بڑے گروہ یعنی مہاجرین و انصار سقیفۂ بنی ساعدہ میں مجتمع ہو گئے ۔ دونوں کا خیال تھا کہ نصب امام یا نصب خلیفۂ رسول امت کی صوابدید پر ہے جس کو امت چاہے اپنا خلیفہ یا امام بنائے اور یہ نصب امامت یا خلافت، رسول اللہ کی تجہیز و تکفین و تدفین سے مقدم ہے۔

تیسرا گروہ بنی ہاشم کا تھا جس کے سردار حضرت علیؑ تھے اُن کا یقین تھا کہ امامت ایک منصبِ ہدایت ہے جو منجانب اللہ ہے اور اُس کی رُو سے بعد رسولؐ حضرت علیؑ امام و خلیفۂ رسولؐ ہیں ۔ یہ گروہ جسدِ رسولؐ کی تدفین کو سب کاموں سے زیادہ مقدم سمجھتا تھا ۔ چنانچہ ادھر تو بنی ہاشم رسول اللہ کے دفن میں مصروف رہے اُدھر سقیفہ[1] میں مہاجرین و انصار انتخابِ خلیفہ میں بحث و تکرار کرتے رہے۔

انتخابِ خلیفہ

مہاجرین کہتے تھے کہ خلیفہ ہم قریش میں سے ہو گا کہ یہی فرمانِ رسولؐ ہے ۔ انصار کہتے تھے کہ ہم نے تمہاری بہ نسبت اسلام کی زیادہ خدمت کی ہے۔ اس لئے امیر ہم میں سے ہونا چاہیئے ۔ غرض کہ اسی بحث و تکرار میں پہلے تو گرما گرمی پھر ہاتھا پائی اور پھر مار پیٹ تک نوبت پہنچ گئی ۔ مشہور صحابی رسولؐ حضرت سعد بن عبادہ کافی زخمی ہو گئے اور اُن کے آدمی اُن کو وہاں سے اسی حالت میں اٹھا کر لے گئے۔

---

[1] سقیفہ ۔ مدینہ منورہ سے تین چار میل کے فاصلہ پر وہ جگہ جہاں عرب کے ڈاکو لوٹ کا مال آپس میں تقسیم کیا کرتے تھے۔

س ہنگامہ کو فرد کرنے کے لئے حضرت عمر نے حضرت ابوبکر کے ہاتھ پر بیعت کر کے اور مہاجرین اور ایک گروہ انصار سے بھی اس کی تائید کرا کے مسئلہ خلافت کو نہایت دانائی سے حل کر دیا۔

جب یہ صحابہ کرام مدینہ واپس آئے تو یہاں جسدِ اطہرِ ختمی مرتبت کو دفن کیا جا چکا تھا۔ تاریخِ اسلام کی یہ کتنی المناک حقیقت ہے کہ لاکھوں صحابہ کے موجود ہونے کے باوجود رسول اللہ کی نماز میت اور تدفین میں صحابہ کرام شرکت نہ کر سکے اور اس سعادت سے محروم رہے۔

باب سوم

پیچیدہ راہیں

خلافتِ مسلمہ

حضرت ابو بکرؓ مسلمانوں کے پہلے خلیفہ تھے۔ آپ کا اسمِ گرامی عبداللہ اور کنیت ابو بکر تھی۔ آپ رسول اللہ کے بچپن کے ساتھیوں میں سے تھے اور حضورؐ سے شروع ہی سے محبت کرتے تھے، بہت نرم دل تھے۔ آپ کا تعلق قبیلہ بنی تیم سے تھا۔ جب حضورؐ نے اعلانِ نبوت کیا تو آپ نے بہت جلد اس کو قبول کر لیا۔ واقعہ معراج پر حضور کے سچے ہونے کی تصدیق کرنے کی وجہ سے مسلمانوں نے آپ کو صدیقِ اکبر کے لقب سے بھی ملقب کیا ہے اور مسلمانوں میں آپ زیادہ تر اسی لقب سے یاد کئے جاتے ہیں۔ اُم المومنین حضرت عائشہؓ کے والد ہونے کی وجہ سے آپ کو رسول اللہ کے خسر ہونے کا بھی شرف حاصل تھا۔ زیادہ تر حضورؐ کے فیضِ صحبت میں رہے۔ ہجرت کے دوران آپ غارِ ثور میں حضورؐ کے ہمراہ تھے۔ ہر لڑائی میں حضورؐ کی سواری کے ساتھ رہے سوائے جنگِ اُحد اور جنگ حنین۔ کہ ان دونوں لڑائیوں میں آپ بھی اور مسلمانوں کی طرح رسول اللہ کو تنہا چھوڑ جانے پر مجبور ہو گئے تھے لیکن جلد ہی آ کر حضورؐ سے مل بھی

گئے تھے۔ ۱۱ھ میں سریر آرائے تختِ خلافت ہوئے ۱۳ھ میں وفات ہوئی آپ کی مدتِ خلافت تقریباً ڈھائی سال ہے۔

آپ کے خلیفہ منتخب ہو جانے کے بعد اس وقت کے مسلمان تین گروہوں میں تقسیم ہو گئے تھے، ایک گروہ وہ تھا جو خلافت و امامت کو منجانب اللہ سمجھ کر حکم خدا اور حکم رسول کے مطابق حضرت علیؑ کو اپنا امام مان رہا تھا۔ اس میں بنی ہاشم کے علاوہ مہاجرین و انصار میں سے کچھ صحابۂ رسول بھی شامل تھے۔ یہ گروہ گروہِ مومنین کہلاتا تھا۔ اگرچہ یہ گروہ بہ لحاظ تعداد اقلیت میں تھا لیکن اپنے کردار و عمل کے لحاظ سے قابلِ تعظیم و تکریم تھا۔

دوسرا بڑا گروہ اُن مسلمانوں کا تھا جو خلافت و امامت کو منجانب الناس سمجھ کر حضرت ابوبکر کو خلیفۂ رسول اور امام تسلیم کرتا تھا۔ اس گروہ میں مہاجرین زیادہ اور انصار کم تھے۔

تیسرا گروہ، وہ تھا جو خلافت و امامت کو منجانب الناس تو سمجھتا تھا لیکن حضرت ابوبکر کو خلیفہ تسلیم نہیں کرتا تھا۔ اس گروہ میں انصار زیادہ اور مہاجرین کم تھے۔ اسی گروہ میں مکہ و مدینہ اور اُن کے اطراف مقبوضہ بلاد اسلام کے مسلمان بھی شامل تھے۔ اسی گروہ میں جھوٹے نبی بھی پیدا ہوئے۔ اسی گروہ کے افراد کو مرتدینِ اسلام اور مانعین زکات کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔

حضرت ابوبکر کو خلافت کا بار اٹھاتے وقت بہت سے داخلی اور خارجی مسائل کا سامنا تھا۔ آپ نے سب سے پہلے لشکر اُسامہ کو اُس کی اس مہم پر روانہ کرنے کا حکم دیا جو رحلتِ رسولؐ کی وجہ سے معرض التوا میں تھی۔ دوسرا اقدام آپ نے گروہِ مومنین کے سردار حضرت علیؑ سے بیعت لینے کا کیا۔ بیعت نہ ہونے کی صورت میں کچھ سختیاں بھی کی گئیں، لیکن حضرت علیؑ اور ان کے پیروؤں نے نہ تو بیعت کی اور نہ حکومت کی مخالفت میں تلوار کھینچی۔ لہٰذا اس گروہ کی طرف سے خلافت کی مخالفت نہ ہونے کا اطمینان ہو جانے کے بعد اُن سے بیعت کے لئے زیادہ اصرار نہیں کیا گیا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ قریۂ فدک جو رسول کی بیٹی حضرت فاطمہ زہرا کی ملکیت اور ان کے قبضہ میں تھا اور جس کو رسول اللہ نے اپنی حین حیات بحکم خُدا ان کو ہبہ کر دیا تھا اس کو بحقِ حکومت ضبط کر لیا۔ اس پر دختر رسول نے دربار خلافت میں جب استغاثہ دائر کیا تو ان سے گواہیاں طلب کی گئیں۔

جب گواہوں میں حضرت علیؑ اور ام ایمن پیش ہوئے تو انہیں ساقط الاعتبار قرار دے کر رد کر دیا گیا۔ اس پر دخترِ رسول حضرت ابوبکر اور حضرت عمر پر بہت غضبناک[1] ہوئیں۔ اور قبرِ رسول پر جا کر فریاد کی۔ اپنے شوہر حضرت علیؑ سے وصیت فرمائی کہ میرے جنازہ میں حضرت ابوبکر و حضرت عمر شرکت نہ کریں۔ چنانچہ جب جناب سیدہ کا انتقال ہوا تو یہ حضرات ان کے جنازہ میں بھی شریک نہ ہو سکے۔

چوتھا اقدام مرتدینِ اسلام اور مانعین زکات کی سرکوبی کا تھا۔ جس کو آپ نے بحسن و خوبی انجام دیا۔ مانعین زکات کے سردار مالک بن نویرہ کا قتل اور اس کے بعد اس کی خوبصورت بیوی پر قبضہ حضرت ابوبکر کے مقرر کئے ہوئے سپہ سالار حضرت خالد بن ولید کا وہ کارنامہ ہے جس کو حضرت عمر بھی برداشت نہ کر سکے، انھوں نے حضرت ابوبکر سے حضرت خالد پر حدِ شرعی جاری کرنے کو کہا، لیکن حضرت ابوبکر مصلحتاً ایسا نہ کر سکے۔

آپ کا پانچواں اقدام آپ کی خلافت کے مخالفین اور جھوٹے نبیوں کی سرکوبی کا تھا، جو آپ کے سپہ سالار حضرت خالد بن ولید کے ذریعہ بخوبی انجام پایا۔

چھٹا اقدام۔ قرآنِ پاک کا محفوظ کرنا اور معاملاتِ شرعیہ کے روبہ عمل لانے کا تھا۔ آپ نے ایک کمیٹی حضرت زید بن ثابت کی سرکردگی میں قائم کر دی تاکہ مسلمان فقہی مسائل بجائے حضرت علیؑ کے (جو وارثِ علم کتاب تھے) حضرت زید بن ثابت سے معلوم کریں اور انھیں کے بتائے ہوئے طریقہ پر عمل کریں۔

ساتواں اقدام۔ اُمہات المومنین حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ اور دیگر صحابہ کبار کے لئے بڑے بڑے وظائف بیت المال سے مقرر کرنا تھا۔

آٹھواں اقدام۔ رسول اللہ کی وفات کی خبر سن کر جب حضرت ابوسفیان مدینہ آئے اور انہیں یہ معلوم ہوا کہ خلافت بجائے علی کے ابوبکر کو مل چکی ہے تو سب سے پہلے وہ حضرت علیؑ کے پاس گئے اور فرمایا۔ یا علی تمہارا حق چھین لیا گیا اور تم خاموش رہے اگر تم چاہو تو میں سوارانِ مکہ

---

[1] سیدہ کا غضبناک ہونا تقریباً تمام کتبِ تواریخ و احادیث میں مرقوم ہے۔ جبکہ رسول اللہ کی یہ متفق علیہ حدیث بھی موجود ہے کہ "فاطمہ میرا جزو ہے جس نے اُسے غضبناک کیا اس نے مجھے غضبناک کیا اور جس نے مجھے غضبناک کیا اس نے خدا کو غضبناک کیا۔"

سے صحرائے مدینہ کو بھر دوں اور تمہارا حق تمہیں دلا دوں۔ لیکن حضرت علیؑ نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور ان سے کہا۔ اے ابوسفیان تم زمانۂ کفر میں بھی فتنہ و فساد برپا کرتے رہے اور اب بھی فتنہ و فساد برپا کرنا چاہتے ہو۔ مجھے حکومتِ دنیا کی تمنّا نہیں ہے۔ ابوسفیان یہاں سے مایوس ہوکر دربارِ خلافت میں پہنچے۔ وہاں حضرت ابوبکر و حضرت عمر سے فرمایا۔ "خلافت کے حقدار بنی ہاشم ہوسکتے ہیں یا بنی امیہ کہ یہ دونوں قبیلے قریش میں مقتدر رہے" اور جب آپ نے خلافت کو تہ و بالا کرنے کی دھمکی دی تو حضرت ابوبکر و حضرت عمر نے فتنہ و فساد رفع کرنے کی خاطر آپ کو شام کی حکومت کی پیش کش کر دی جو آپ نے قبول فرمالی۔

لیکن ابوسفیان اپنی پیرانہ سالی کی وجہ سے خود تو نہ جاسکے اپنی بجائے اپنے بڑے صاحبزادے یزید ابنِ ابوسفیان کو شام کے اُن علاقوں کا حکمران بنا کر بھیج دیا جو مسلمانوں کے قبضے میں تھے۔ اس طرح نہایت خوش اسلوبی سے یہ بڑا فتنہ بھی دب گیا جو اور بغاوتوں اور فتنوں سے زیادہ خطرناک ہوتا۔

حضرت ابوبکر نے اپنے دورِ خلافت میں حضرت عمر کے مشورہ و اعانت سے نہ صرف داخلی استحکام کیا بلکہ عراق و ایران وغیرہ کی فتوحات کی داغ بیل بھی ڈال دی۔

جب آپ کا وقت رحلت قریب آیا تو آپ نے تحریری طور سے حضرت عمر کو اپنا جانشین مقرر فرما دیا۔ ممکن ہے کہ آپ نے یہ اقدام قرآنِ پاک کی آیت ھل جزاء الاحسان الاالاحسان کے تحت سقیفہ کا بدلہ چکانے کے لئے کیا ہو، ورنہ جس تحریری استخلاف کو رسول اللہ کے لئے ناپسند کیا گیا وہ خود اپنے لئے کیوں اختیار کیا گیا اور اُمت کی صوابدید پر کیوں نہ چھوڑا گیا؟

بہرحال مسلمانوں نے نصب خلافت کا یہ بھی اصول قبول کر لیا۔ اور اس طرح پہلا اصول اجماع اور دوسرا استخلاف قرار پایا۔ چنانچہ حضرت ابوبکر کی رحلت کے بعد حضرت عمر دوسرے خلیفہ قرار پائے۔

حضرت عمر ابن خطّاب

مسلمانوں کے دوسرے خلیفہ تھے۔ آپ کا نام نامی عمر، والدِ ماجد کا نام خطّاب بن نوفل تھا آپ کی کنیت ابوحفص تھی آپ قبیلہ بنی عدی سے تھے۔ مسلمانوں نے آپ کو فاروق اعظم کا خطاب دیا اور اسی سے آپ زیادہ مشہور ہیں۔ اسلام لانے سے پہلے اسلام کے سخت مخالف تھے لیکن قبول اسلام کے بعد اسلام پھیلانے اور مسلمانوں کی تعداد بڑھانے میں صحابۂ رسول میں سے اور کوئی خلیفہ آپ کی برابری نہ کرسکا۔

فتوحات میں آپ کا نام سر فہرست آتا ہے۔ آپ بہت غصہ ور تھے مدینہ کا ہر شخص آپ کی شخصیت سے مرعوب اور آپ کے درّہ سے خائف و ترساں رہتا تھا۔ اسی کے ساتھ آپ بہترین خطیب بھی تھے آپ کی شعلہ بار تقریر سے مجمع پر ایک خاص اثر ہوتا تھا۔ ام المومنین حضرت حفصہ کے والد ہونے کی وجہ سے حضرت ابوبکر کی طرح آپ کو بھی رسول اللہ کے خسر ہونے کا شرف حاصل تھا۔ سیاسی تدبر میں اپنا جواب آپ تھے۔ زمانۂ رسالت میں جو جو دفاعی جنگیں ہوئیں تقریباً سب میں ہی آپ نے شرکت کی۔ البتہ جنگ احد و خندق، خیبر و حنین میں اور مسلمانوں کی طرح، آپ سے بھی اعراض ہو گیا تھا۔
سنہ ۱۳ھ میں زمام اختیار سنبھالنے کے بعد داخلی استحکام سے مطمئن ہو کر آپ نے بیرونی فتوحات کی طرف توجہ دی۔ عراق، شام، ایران، فلسطین اور مصر پر مکمل طور پر قبضہ آپ کے ہی دورِ حکومت میں ہوا، اور اتنا مالِ غنیمت حاصل ہوا کہ ہر شخص خوشحال ہو گیا اور مدینہ میں کوئی شخص زکات لینے والا نہ رہا۔ اسی لئے آپ کا دور مسلمانوں کی تاریخ میں سنہرا دور کہے جانے کا مستحق ہے۔ آپ نے حکومت کو ایک باقاعدہ شکل عطا کی۔ پوری مملکتِ اسلامیہ کو دس صوبوں میں تقسیم کر کے ہر جگہ علیحدہ علیحدہ گورنر مقرر کئے۔ فوج کا ایک علیحدہ محکمہ قائم کیا۔ کوفہ شہر کو ایک فوجی چھاؤنی کی شکل میں آباد کیا۔ فوجیوں کے لئے قوانین وضع کئے۔ محکمۂ قضا قائم کر کے ہر جگہ کے لئے علیحدہ علیحدہ قاضی مقرر کئے۔ پولیس کا محکمہ بھی آپ ہی کی ایجاد ہے۔ ڈاک کا محکمہ بھی سب سے پہلے باقاعدگی کے ساتھ آپ ہی نے قائم کیا۔ آپ کے نظام حکومت کو بہت سے مسلمان حکمرانوں کے علاوہ کتنے ہی عیسائی حکمرانوں نے بھی پسند کر کے اپنے یہاں رائج کیا ہے۔ درآں حالیکہ وہ مسلمانوں کے دشمن تھے۔

آپ ایک بااصول آدمی تھے۔ عوام اور فوج میں کسی کی مقبولیت کو حکومت کے لئے خطرہ خیال کرتے تھے۔ اسی وجہ سے حضرت خالد بن ولید کو عین میدانِ جنگ میں سپہ سالاریٔ لشکر سے معزول کر دیا تھا۔ نفاذ شریعت کے سلسلہ میں آپ بہت سخت تھے، اپنی اولاد کے ساتھ بھی رو رعایت نہیں کرتے تھے۔ مثال کے لئے آپ کے صاحبزادے ابوشحمہ کا واقعہ تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا کہ جب اُن پر شراب پینے اور زنا کرنے کا جُرم ثابت ہو گیا تو آپ نے اُن کو شریعت کے مطابق کوڑوں کی سزا کا حکم دیا اور جب دو چار کوڑوں میں اُن کی روح جسدِ عنصری سے پرواز کر گئی تو آپ نے سزا کے بقیہ کوڑے اُن کی میت کو لگانے کا حکم صادر فرمایا۔ شاید مرے

پر سو دُرے اسی واقعہ سے ضرب المثل بنی ہے۔

آپ اپنے عمّال کی بدعنوانی کسی صورت برداشت نہیں کرتے تھے۔ شام کے حاکم امیر معاویہ نے جب شاہانہ ٹھاٹ باٹ اختیار کیا تو آپ نے اُن کو سخت تنبیہہ کی ــــ یہ دوسری بات ہے کہ انہوں نے اس تنبیہہ کی کوئی پرواہ نہ کی کیونکہ وہ شام کو از روئے استحقاق اپنی جاگیر سمجھتے تھے۔

مسائل دینیہ کے لئے جو کمیٹی حضرت ابوبکر کے زمانے میں حضرت زید بن ثابت کی سرکردگی میں بنی تھی وہ آپ نے بھی بدستور قائم رکھی اور اکثر اس کی نگرانی کے فرائض بھی آپ ہی انجام دیتے تھے۔ آپ نے اپنے اجتہاد سے متعہ کو جو خدا کے حکم سے زمانہ رسول و زمانۂ حضرت ابوبکر تک حلال تھا حرام قرار دے دیا کیونکہ آپ کے خیال سے اس کی وجہ سے مسلمان عیّاشی کی طرف راغب ہو جاتے۔ صبح کی اذان میں (الصلوٰۃ خیر من النوم) داخل کر کے مسلمانوں کو صبح کی نماز سے غفلت نہ برتنے کا سبق دیا۔ قرآن کی حفاظت اور اُس کی ترقی و ترویج کے لئے آپ نے ماہِ رمضان المبارک میں نماز تراویح قائم کی اور اس کی تاکید کی۔ اگر آپ سے یا آپ کی اجتہادی کمیٹی سے کوئی دینی یا دنیوی مسئلہ حل نہیں ہوتا تھا تو آپ بلا تکلف اُس کو حضرت علیؑ سے دریافت کر لیتے تھے۔ اسی وجہ سے تاریخ میں آپ کا یہ جملہ بار بار نظر آتا ہے کہ "لولا علی لھلک عمر" یعنی اگر علی نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتا۔

آپ خانوادۂ رسالت کی غلامی کو نہ صرف باعثِ فخر سمجھتے تھے بلکہ باعثِ نجات اُخروی بھی خیال کرتے تھے۔ اس سلسلے میں آپ کے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن عمر اور حسینؑ بن علیؑ کا واقعہ بہت مشہور ہے کہ جب امام حسینؑ نے حضرت عبداللہ بن عمر کو غلام زادہ کہہ دیا تو وہ روتے ہوئے اپنے باپ کے پاس گئے اور امام حسین کی شکایت کی، اس پر آپ نے اُن سے فرمایا کہ جاؤ بیٹا اُن سے لکھوا کر لاؤ اگر انہوں نے یہ تحریر لکھدی تو میری اور تمہاری دونوں کی بخشش ہو جائے گی اور اس تحریر کو میری میت کے ساتھ ہی میری قبر میں دفن کر دینا ــــ آپ نے تقریباً دس سال تک نہایت دبدبہ سے کارِ خلافت انجام دیئے ــــ چاروں طرف مسلمانوں کی دھاک بیٹھ گئی ــــ اواخر ۲۳ھ میں ایک غلام ابولولو فیروز نے آپ پر قاتلانہ حملہ کیا جس سے آپ جانبر نہ ہو سکے ــــ رحلت سے قبل

آپ نے اپنے جانشین کے انتخاب کے لئے چھ آدمیوں کی ایک کمیٹی مقرر فرمادی کہ وہ اپنے آپ میں سے جس کو بھی چاہیں اپنا خلیفہ مقرر کرلیں ــــ خاص طور سے حضرت عبدالرحمن بن عوف کو تقرر خلافت کے لئے زیادہ اختیار دیا ــ اور اپنے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن عمر کو اس کمیٹی کی نگرانی کے لئے مقرر کیا لیکن اس انتخاب میں ان کے حصہ لینے کو منع کردیا کیونکہ آپ کا خیال تھا کہ خلافت کو نسلی استحقاق سے مُبرّا ہونا چاہیئے ــ

ارکانِ شوریٰ میں سے حضرت عبدالرحمن بن عوف نے خلافت کی امیدواری سے دست بردار ہونے کا اعلان کردیا ــــ اب مقابلہ پانچ اصحاب میں تھا۔ حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت طلحہ، حضرت زبیر اور حضرت سعد بن ابی وقاص ــ لہذا حضرت عبدالرحمن بن عوف نے سب سے پہلے حضرت علی سے دریافت کیا کہ آیا آپ کتابِ خدا، سنت رسول اور سیرت شیخین کے مطابق امور خلافت انجام دیں گے ؟ حضرت علی نے جواب دیا کہ اگر سیرتِ شیخین کتاب خدا اور سنتِ رسول کے مطابق ہوگی تو میں اس پر عمل کروں گا اور اگر اس سے علیحدہ کوئی چیز ہے تو میں اُس پر عمل نہیں کروں گا ــ اس کے بعد یہی سوال حضرت عثمان سے کیا گیا تو انہوں نے اس کا جواب اثبات میں دیا ــ چنانچہ عبدالرحمن بن عوف نے فوراً ہی حضرت عثمان کو خلافت کے لئے نامزد کردیا۔ یہاں اس موقع پر تاریخ کے ایک طالب علم کو یہ بات بہت کھٹکتی ہے کہ یہی سوال حضرت طلحہ، حضرت زبیر اور حضرت سعد بن ابی وقاص سے کیوں نہیں کیا گیا ؟ کیا یہ حضرات بھی حضرت عبدالرحمن کی طرح خلافت سے دست بردار ہو گئے تھے ؟ اگر ان کی دست برداریٔ خلافت کا کوئی تاریخی ثبوت فراہم نہ ہوسکا تو پھر تو ان کے ساتھ سراسر ظلم و زیادتی ہوئی ــ

بہرحال جو کچھ بھی ہو بظاہر حضرت عثمان کا اس طرح نامزد ہونا ایک طرح کا استخلاف ہی ہے حضرت عمر کی طرف سے نہ ہوا تو حضرت عبدالرحمن کی طرف سے ہوگیا۔ لیکن چونکہ مسلمانوں نے اس نامزدگی کو شوریٰ کا نام دیا ہے تو ایسا ہی سہی ــــ اس طرح تیسری خلافت کا تیسرا اصول شوریٰ قرار پایا ــ

حضرت عثمان بن عفّان

مسلمانوں کے تیسرے خلیفہ تھے ــ آپ کا اسم گرامی عثمان والد کا نام عفّان تھا۔ آپ کا تعلق خاندانِ بنی اُمیّہ

سے تھا۔ آپ ایک کامیاب تاجر ہونے کی وجہ سے کافی مال واملاک کے مالک تھے لہذا مسلمانوں نے آپ کو غنی کے لقب سے ملقب کیا ہے اور اسی لقب سے زیادہ مشہور ہیں مسلمانوں کے ایک طبقہ کے مطابق چونکہ رسول اللہ کی دو صاحبزادیوں کی شادی یکے بعد دیگرے آپ کے ساتھ ہوئی تھی۔ اس لئے آپ کو ذوالنورین بھی کہا جاتا ہے۔ جن لوگوں نے اسلام قبول کرنے میں سبقت کی تھی، آپ کا شمار بھی انہیں میں ہوتا ہے۔ مکّہ سے ہجرت کر کے آپ بھی مدینہ میں ہی اقامت گزیں ہو گئے تھے۔ آپ ایک عبادت گزار بزرگ تھے۔ تجارتی مشاغل کے بعد آپ کا زیادہ تر وقت تلاوتِ قرآن میں گزرتا تھا۔ آپ طبعاً جدال و قتال کو پسند نہیں کرتے تھے اسی وجہ سے عہد رسالت کی کسی جنگ میں آپ کا کوئی کارِ نمایاں نظر نہیں آتا۔ البتہ جنگ احد اور جنگ حنین میں دیگر مسلمانوں کی طرح آپ بھی رسول اللہ کو میدانِ جنگ میں تنہا چھوڑ کر چلے جانے پر مجبور ہو گئے تھے۔ بعد خاتمۂ جنگ رسول اللہ کے پاس واپس آنے والے صحابۂ کرام میں آپ کا آخری نمبر تھا۔ آپ کے شغف عبادت کو دیکھتے ہوئے اس بات کا قوی امکان ہے کہ آپ کسی گوشہ میں مصروفِ عبادت ہو کر اسلام کی فتح کی دعائیں مانگ رہے ہوں گے۔ سیاسی تدبر میں آپ کی نظر حضرت عمر کی طرح عمیق نہیں تھی اور امور سلطنت کی انجام دہی میں بھی آپ کا میلان طبع زیادہ نہیں تھا۔

۲۴ھ میں زمام حکومت سنبھالنے سے قبل اگرچہ آپ نے حضرت عبدالرحمن بن عوف کی عائد کردہ شرط کتابِ خدا، سنتِ رسول اور سیرت شیخین پر عمل پیرا ہوتے کا وعدہ کر لیا تھا۔ لیکن پہلے ہی مرحلہ پر ابو سفیان کے مشورہ سے اپنے ایک رشتہ دار مروان بن الحکم کو اُن کی جلاوطنی ختم کر کے اپنا وزیر اعظم بنا لیا۔ یہ مروان وہ صاحب تھے جو زمانۂ رسول میں منجملہ اور کاتبانِ وحی کے ایک کاتبِ وحی تھے لیکن قرآنی آیات میں تحریف کرنے کی وجہ سے رسول اللہ نے ان کو جلاوطن کر دیا تھا، اور مدینہ میں ان کا داخلہ ممنوع قرار دے دیا تھا۔ بعد رسول حضرت ابوبکر و حضرت عمر کے زمانۂ خلافت میں بھی یہ جلاوطن ہی رہے۔ زمانۂ خلافت حضرت عثمان میں نہ صرف ان کی جلاوطنی ختم ہوئی، بلکہ یہ خلافتِ اسلامیہ میں وزیر اعظم کے عہدہ پر فائز ہو کر تمام امورِ مملکت کو اپنی حسبِ مرضی انجام دینے لگے۔ اپنا دائرہ اثر اتنا بڑھایا کہ حضرت عثمان ایک آئینی خلیفہ بن کر رہ گئے، سارے اختیارات انھیں کے ہاتھ میں آ گئے۔ ابتدائی دورِ خلافت میں کچھ فتوحات کا سلسلہ چلا تھا لیکن آخر دور میں

داخلی انتشار اور بے چینی اس قدر بڑھ گئی کہ اس نے تفرقہ کی صورت اختیار کرلی۔ ملتِ مسلمہ کئی گروہوں میں تقسیم ہو گئی اور ان میں آپس میں ایک دوسرے کے درمیان ایسی خلیج پیدا ہو گئی جو شاید قیامت تک پُر نہ ہو سکے۔ عام خیال یہ ہے کہ ان تمام شورشوں کا سبب مروان بن الحکم کی ذات تھی، اور حضرت عثمان اس معاملہ میں مجبور کر دیئے گئے تھے۔

مگر آئینی اور اصولی طور پر چونکہ حضرت عثمان ہی خلیفہ تھے لہٰذا اس وقت کے تمام صحابہ کبار حضرت کو ہی ان تمام خرابیوں کا ذمہ دار قرار دے رہے تھے۔

آپ کے دورِ خلافت کا سب سے بڑا کارنامہ قرآنِ پاک کی از سرِ نو ترتیب ہے جو موجودہ شکل میں آج بھی رائج ہے۔ اس میں کوئی تحریف نہیں ہوئی۔ مسلمانوں کے ہر مکتبۂ فکر کے نزدیک اس پر مکمل ایمان رکھنا لازمی ہے۔ خانوادۂ رسالت کے پہلے امام حضرت علیؑ سے لے کر گیارہویں امام حسن عسکری تک کسی امام نے بھی اس کی مخالفت نہیں کی اور نہ اس پر اعتراض کیا۔ لہٰذا کسی مسلمان کو اس قرآن میں تحریف کرنے یا اسے تحریف شدہ سمجھنے کا بالکل حق حاصل نہیں ہے۔ البتہ تاریخ کے طالب علم کو یہ بات حیرت میں ڈالتی ہے کہ زمانۂ حضرت ابوبکر میں جمع کر کے مرتب کیا ہوا قرآن جو حضرت عمر کے دورِ خلافت تک تمام بلادِ اسلامیہ بشمول مدینہ منورہ رائج تھا اور اُس کے حفاظ بھی موجود تھے اور تحریری طور پر بھی اس کی نقول ہر جگہ موجود تھیں تو پھر اس میں کیا خامی تھی کہ حضرت عثمان کے زمانہ میں اُس قرآن کے تمام کے تمام نسخے جو تمام بلادِ اسلامیہ میں پہنچ چکے تھے یا جو مدینہ میں لوگوں کے پاس موجود تھے اِن سب کو اور حضرت ابوبکر کے اصل نسخۂ قرآن کو حضرت عائشہ سے لے کر اور صحابیٔ رسول عبداللہ بن مسعود سے زبردستی ان کا نسخۂ قرآن لے کر نذرِ آتش کیا گیا۔ اس کی جو بھی توجیح کی جائے گی نتیجہ یہی نکلے گا کہ حضرت ابوبکر اور حضرت عثمان کے ادوارِ خلافت میں مرتب ہونے والے قرآن کے نسخوں میں کوئی مکتوبی فرق ضرور ہو گا ورنہ اتنے نسخہ ہائے قرآن جلانے کا جواز کیا ہے۔؟

آپ کے عہدِ خلافت میں حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر صحابہ کبار کو ہٹا کر بنی اُمیّہ کے نااہل افراد کو فائز کیا گیا۔ جس سے مدینہ میں صحابۂ کبار اور اُن کی جوان اولادیں آپ کے خلاف ہو گئیں۔ ان نااہل افراد کے تقرر سے عامۃ المسلمین، مختلف پریشانیوں اور مصائب میں مبتلا ہو کر آپ سے

بدظن رہنے لگے۔ بعض صحابۂ کبار کے ساتھ انتہائی بربریت اور بے رحمی کا سلوک کیا گیا۔ حضرت عبدالرحمن بن عوف کو جنہوں نے حضرت عثمان کو خلیفہ مقرر کیا تھا کسی ناراضگی کی بنا پر جلا وطن کر دیا گیا۔ حضرت ابوذر غفاریؓ کو شام سے مدینہ تک ایک برہنہ پیٹھ اور مجنون اونٹ پر بٹھا کر لایا گیا اور پھر مدینہ سے ربذہ جلا وطن کر دیا گیا جہاں انہوں نے عالم غربت اور تنہائی میں انتقال کیا۔ حضرت عمار یاسر کو نہایت بیدردی سے پٹوایا گیا۔ بعض اُمہات المومنین اور بعض صحابۂ کبار کے وظائف جو بیت المال سے حضرت ابوبکر و حضرت عمر کے زمانہ سے مقرر تھے اور سیرتِ شیخین پر عمل در آمد کی رُو سے ان کو جاری رکھنا حضرت عثمان کے لئے لازمی تھا وہ بند کر دیئے گئے جس کی وجہ سے وہ سب افراد جن کے وظیفے بند ہوئے تھے آپ سے سخت ناراض ہو گئے خصوصاً ام المومنین حضرت عائشہ نے مدینہ کی ساری آبادی کو آپ کے خلاف کر دیا۔ وہ خود علی الاعلان آپ کی مخالفت کر رہی تھیں۔ انہوں نے آپ کو نعثل کے خطاب سے بھی نوازا تھا۔ اور لوگوں کو آپ کے قتل پر اکسایا تھا۔ اس کے علاوہ تمام بلاد اسلامیہ میں حضرت عثمان کے مقرر کئے ہوئے گورنروں اور عمال کی بداعمالیوں کی وجہ سے عام بے چینی پھیل رہی تھی۔ عامۃ الناس پریشان تھے اور جب وہ ان عمال کی شکایات دربارِ خلافت میں اپنے وفود بھیج کر کرتے تو بجائے ازالۂ شکایت کے اُن پر مظالم توڑے جاتے۔ آپ کی شہادت کا سبب بھی ایک ایسا ہی واقعہ ہوا۔

مصری گورنر عبداللہ ابن سعد ابن ابی سرح کے مظالم کی شکایت لے کر تقریباً چالیس آدمیوں کا ایک وفد مصر سے مدینہ آیا۔ ناانصافیوں سے تنگ آئے ہوئے صحابۂ کبار نے بھی اس وفد کی درپردہ حمایت کی۔ وفد کا مطالبہ تھا کہ موجودہ گورنر کو ہٹا کر کوئی دوسرا گورنر مقرر کیا جائے۔ بڑی ردّ و قدح اور بحث و تمحیص کے بعد ابن ابی سرح کے بیٹے کی جگہ محمد ابن ابوبکر خلیفہ اوّل کے صاحبزادے کو مصر کے گورنر کی حیثیت سے منظور کر لیا گیا۔ مصری وفد بھی اس پر راضی ہو گیا۔

جب محمد ابن ابوبکر وفد کے ہمراہ مصر روانہ ہو گئے تو اُن کے عقب میں حضرت عثمان ہی کا ایک غلام اُن کی اونٹنی پر سوار ہو کر عازم مصر ہوا لیکن راستہ میں مصری وفد کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا۔ تلاشی لینے پر حضرت کی مُہر لگا ہوا ایک فرمان جو گورنر مصر کے نام تھا برآمد ہوا۔ جس میں اُسے ہدایت کی گئی تھی کہ بجائے گورنری کے چارج دینے کے محمد ابنِ ابوبکر کو قتل کر دینا۔ محمد ابنِ ابوبکر مع اُس

مصری وفد اور گرفتار شدہ غلامِ عثمان مدینہ واپس آ گئے۔ اور پھر انہوں نے تمام اہلِ مدینہ کو اپنے ساتھ لے کر اس معاملہ کو حضرت عثمان کے سامنے پیش کیا۔ انہوں نے اس تحریر سے اور اس کے بھیجے جانے سے اپنی لاعلمی ظاہر کرتے ہوئے مروان کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ تب اہلِ مدینہ نے اُن سے مروان کو سزا دینے کے لئے کہا لیکن انہوں نے ایسا کرنے سے اپنی معذوری ظاہر کی، اس پر مدینہ کے تمام نوجوان جو صحابۂ کبار کی اولاد تھے مصری وفد کے ساتھ ہو گئے، اور ان سب نے حضرت عثمان کے مکان کا محاصرہ کر لیا۔ حضرت عثمان نے کسی نہ کسی طرح حضرت علی کو اپنی مدد کے لئے پیغام بھجوایا، انہوں نے اپنے دونوں بیٹوں امام حسن اور امام حسین کو ان کی حفاظت کے لئے بھیج دیا اور وہ دونوں آپ کے دروازہ پر پہرہ دینے لگے۔ اب پر مصری گروہ اور ان کے حامیوں نے بجائے دروازہ کے عقبِ مکان سے ملحق ایک مکان سے جس کی نشاندھی مسلمانوں کے عشرۂ مبشرہ کے ایک فرد (حضرت طلحہ) نے کی تھی، آپ کے مکان میں گھس کر آپ کو شہید کر دیا۔ آپ اس وقت تلاوتِ قرآن میں مصروف تھے۔ مروان بن حکم پراسرار طریقے سے اپنی جان بچا کر شام پہنچ گئے۔

اگرچہ ان تمام خرابیوں کے ذمہ دار مروان ہی تھے لیکن اہلِ مدینہ ان کی وجہ سے حضرت عثمان سے ہی ناراض تھے، اور ان کی ناراضی کا یہ عالم تھا کہ بعد قتل حضرت عثمان کی میت کو تین روز تک بے دفن و کفن رہنے دیا گیا۔ حالانکہ اس وقت مدینہ کی آبادی دو ڈھائی لاکھ کے لگ بھگ تھی لیکن کسی شخص کو بھی آپ کی میت کی تجہیز و تکفین و تدفین کی توفیق نہ ہوئی۔ حتیٰ کہ جب حضرت علی نے قبولِ خلافت سے پہلے یہ شرط رکھی کہ جب تک حضرت عثمان کی میت کو دفن نہیں کر دیا جائے گا وہ خلافت قبول کرنے پر غور نہیں کریں گے۔ چنانچہ اہلِ مدینہ نے اُس وقت حضرت عثمان کی میت کو دفن کیا۔

اب اہلِ مدینہ نے جن میں تمام صحابۂ کبار بھی شامل تھے۔ حضرت علی سے بارِ خلافت اٹھانے کی درخواست کی۔ آپ نے جواب دیا کہ جس طرح تم اب تک خلیفہ بناتے آئے ہو اُسی طرح اب بھی تم کسی دوسرے کو اپنا خلیفہ منتخب کر لو کیونکہ میں تو کتابِ خدا اور سنتِ رسول کے ہی مطابق عمل کروں گا اور وہ نظام بہت سخت ہو گا۔ اہلِ مدینہ نے اس پر بھی آپ سے ہی بارِ خلافت

اٹھانے پر اصرار کیا۔ اس اصرار کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ حالات کی نزاکت کے پیشِ نظر کوئی دوسرا شخص بارِ خلافت اٹھانے کے لئے تیار ہی نہ تھا۔ آخر بہت اصرار کے بعد مسلمانوں کی بہبودی کے پیشِ نظر آپ نے بارِ خلافت اٹھانا قبول کرلیا۔

چوتھی خلافت کے بیان سے قبل ایک ضروری امر بیان کرنا ہے اور وہ یہ کہ مندرجہ بالا تمام حقائق پر پردہ ڈالنے اور شواہد کو مسخ کرنے کے لئے اُس دور کے یا بعد کے ادوار کے کچھ ذہین اور چالاک افراد نے عبد اللہ ابنِ سبا کا ایک بے بنیاد اور فرضی کردار تاریخ میں پیش کیا۔ جس سے اُن کے دو مقصد تھے۔ ایک تو یہ کہ صحابہ کبار کو خونِ عثمان سے بری الذمہ قرار دیا جائے۔ دوسرے یہ کہ اس گروہ کے خلاف نفرت پیدا کی جائے جو بعد رسول حضرت علی کو حکمِ خدا اور فرمانِ پیغمبر کے مطابق وارثِ علمِ کتاب اور امام مامور من اللہ سمجھتا ہے۔

عبد اللہ بن سبا کی حقیقت ایک فرضی افسانے سے زیادہ اس وجہ سے بھی نہیں ہے کہ تاریخ عرب کی روشنی میں جبکہ ایک معمولی سے معمولی انسان کے کوائف تحریری طور سے نظر آتے ہیں تو ایک ایسی با اثر شخصیت جس نے بقول اُن کے تمام صحابۂ کبار اور ان کی اولادوں، اُم المومنین حضرت عائشہ، تمام ساکنانِ مدینہ، اور تمام بلادِ اسلامیہ کے مسلمانوں کو ورغلا کر حضرت عثمان کے خلاف کردیا تھا، وہ حضرت علی کے چوتھے خلیفہ ہوتے ہی ایسا غائب ہوا کہ اس کا کوئی پتہ نشان نہ ملا۔ نہ معلوم زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا، وہ کہاں مرا، کہاں دفن ہوا، اُس کے نظریات و عقائد کیا تھے۔ اُس کے ماننے والوں میں اب بھی روئے زمین پر کوئی موجود ہے یا نہیں؟ تاریخ اس بارے میں خاموش ہے۔ اس فرضی کردار کو حقیقت سمجھنے والے کیا یہ بتانے کی زحمت گوارا کریں گے کہ عبد اللہ بن سبا کے مقابلہ میں وہ دوسری ہستی کون تھی جس نے حضرت علی کے خلیفہ ہوتے ہی عبد اللہ بن سبا کے اثر کو بالکل زائل کردیا اور تمام صحابہ کبار، اُم المومنین حضرت عائشہ، حضرت معاویہ، اور بلاد اسلامیہ کے دیگر مسلمانوں کو حضرت علی کے خلاف صف آرا کردیا۔ اور قیام حکومتِ الٰہیہ کے لئے حضرت علی کی کوششوں کو ناکام کرکے مسلمانوں کے درمیان ایسی خلیج حائل کردی جس کا پُر ہونا قیامت سے پہلے مشکل نظر آتا ہے۔؟

حضرت علی ابن ابی طالب

مسلمانوں کے چوتھے خلیفہ تھے۔ آپ کا اسم گرامی علی کنیت ابوالحسن لقب ابوتراب ہے۔ مسلمانوں نے آپ کو کرم اللہ وجہہ کے خطاب سے نوازا ہے اور اپنے نام کے ساتھ اسی لقب سے زیادہ یاد کئے جاتے ہیں۔ آپ کا تعلق قبیلہ بنی ہاشم سے تھا۔ رسول اللہؐ کے چچازاد بھائی اور داماد بھی تھے۔ بچپن سے ہی رسول اللہؐ کے پاس تربیت پاکر اتباع رسول میں سب سے بلند مقام حاصل کیا۔ زمانۂ رسالت کی دفاعی جنگوں میں سب سے بڑھ کر حصہ لیا۔ کرّار غیر فرار ہونے کی وجہ سے کسی جنگ میں رسول اللہؐ کو تنہا چھوڑ کر نہیں گئے۔ اکثر جنگوں میں فتحیابی کا سہرا آپ ہی کے سر بندھا۔ شجاعت کے ساتھ حلم و مروّت۔ جود و سخا، عبادت و ریاضت، زہد و تقویٰ، علم و حکمت اور فیصلہ مقدمات میں ایک امتیازی درجہ کے مالک تھے۔ ۳۵ھ میں مسلمانوں نے آپ کو چوتھا خلیفہ تسلیم کر لیا لیکن آپ کا یہ تقرر مسلمانوں کے مسلّمہ چار اصول (اجماع، استخلاف، شوریٰ اور قہر و غلبہ) کے مطابق نہ تھا۔ اسی وجہ سے مسلمانوں کا ایک طبقہ زبانی طور سے تو آپ کو خلافتِ راشدہ میں سے چوتھا خلیفہ تسلیم کرتا ہے لیکن عملی طور سے وہ ان سے لاتعلق رہتا ہے۔ اس کی حالیہ مثال یہ ہے کہ یوم حضرت ابوبکر، یوم حضرت عمر اور یوم حضرت عثمان تو بڑے زور شور سے منائے گئے لیکن یوم علی کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا۔ اس کے بجائے یوم معاویہ بڑے اہتمام سے منایا گیا۔ اس طبقہ کے ایک فرد نے ایک کتاب خلافتِ معاویہ و یزید لکھ کر اپنے آقاؤں کی خوب خوب مدح کی ہے۔ خیر اب تو وہ اپنی اس مدح سرائی کی داد وصول کرنے اُن کے پاس پہنچ چکے ہیں۔ لیکن اُن کے ہم خیالوں کی اب بھی کوئی کمی نہیں ہے۔ بہر حال ان تمام باتوں کے باوجود حضرت علی مسلمانوں کے مسلّمہ چوتھے خلیفہ ہیں۔

آپ نے عنانِ حکومت سنبھالتے ہی حکومت کو حاکمیتِ الٰہی کے تحت چلانے کے لئے سب سے پہلے حضرت عثمان کے زمانہ کے بدعنوان عمّال اور گورنروں کو یک قلم معزول کر دیا۔ سوائے امیر معاویہ کے سب نے تعمیلِ حکم کی۔ امیر معاویہ اگرچہ آئینی طور سے خلافت اسلامیہ کی جانب سے شام کے گورنر تھے لیکن عملی طور سے وہ اپنے والد کے استحقاق کی وجہ سے شام کے مطلق العنان حکمران تھے۔ انہوں نے جب حضرت عمر جیسی شخصیت کے احکام ماننے سے انکار

کر دیا تو پھر حضرت علی سے وہ کیا خائف ہوتے۔ انہوں نے بدستور شام پر اپنی حکمرانی قائم رکھی اور الٹا حضرت علی سے خونِ عثمان کا قصاص لینے کے بہانے ان کے خلاف فوج کشی سے بھی دریغ نہیں کیا۔ اس کا تذکرہ آئندہ آئے گا۔

حضرت علی مسندِ خلافت پر بیٹھنے کے پہلے ہی دن شام کو جب بیت المال کا حساب دیکھنے پہنچے اور چراغ جلا کر حساب کرنے لگے تو حضرت طلحہ اور حضرت زبیر اپنی اُن مراعات کے (جو زمانہ حضرت ابو بکر و حضرت عمر میں ان کو حاصل تھیں اور جو زمانہ حضرت عثمان میں بند ہو گئی تھیں) دوبارہ جاری ہونے کی اُمید میں ان کے پاس بیت المال میں ہی پہنچ گئے حضرت علی نے چراغ گل کر دیا۔ جب ان دونوں نے حضرت علی سے اس کی وجہ دریافت کی تو آپ نے جواب دیا کہ تم مجھ سے نجی گفتگو کرو گے اور یہ چراغ بیت المال کے تیل سے روشن ہے اور میں یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ بیت المال کا تیل ہماری نجی گفتگو میں صرف ہو۔ یہ سن کر حضرت طلحہ و زبیر بغیر عرضِ مدعا کئے واپس چلے گئے۔ اور نکث بیعت کر کے مکہ روانہ ہو گئے۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے ام المومنین حضرت عائشہ کو حضرت علی کے خلاف جنگ پر آمادہ کر لیا۔ ام المومنین، حضرت طلحہ و زبیر و دیگر اکابر صحابہ کے ہمراہ مکہ سے بصرہ تشریف لائیں۔ یہاں پر مسلمانوں کی ایک بڑی فوج تیار کر کے مقابلہ کی تیاری شروع کر دی۔ حضرت علی کو جب اس کی اطلاع ملی تو وہ مدینہ سے بصرہ تشریف لائے اور ام المومنین کو اس ارادہ سے باز رہنے کی تلقین کی لیکن انہوں نے جنگ کرنا ہی پسند کی اور حضرت علی کی فوج پر حملہ کا حکم دے دیا۔ چونکہ آپ ایک اونٹنی پر بیٹھ کر جنگ کی نگرانی اور لشکر کی کمان کر رہی تھیں اس لئے تاریخ نے اس جنگ کو جنگِ جمل کا نام دیا ہے۔ مسلمان اس اونٹنی کو چاروں طرف سے حفاظت میں لئے ہوئے مصروفِ جنگ تھے۔ بالآخر دونوں طرف کے ہزاروں مسلمان کام آنے کے بعد حضرت علی کو فتح حاصل ہوئی۔ آپ نے بعد فتح اُم المومنین کو بصد احترام مدینہ پہنچا دیا اور اپنا مرکز خلافت مدینہ کے بجائے کوفہ مقرر کیا۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ فوراً ہی امیر معاویہ نے ایک بہت بڑے لشکر کے ساتھ حضرت علی پر حملہ کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ چنانچہ وہ اپنی فوجیں لے کر میدانِ صفین میں خیمہ زن ہو گئے۔ حضرت علی نے ان کو بھی اس خونریزی سے باز رہنے کی تلقین کی اور یہاں تک کہا کہ بجائے مسلمانوں کے خون بہانے کے

میدان جنگ میں صرف ہم اور تم مقابلہ کریں جو فتحیاب ہو گا وہی خلافت کا حقدار ہو جائے گا۔ لیکن انہوں نے اس پیش کش کو ٹھکرا دیا اور اپنی فوجی طاقت کے گھمنڈ پر جنگ کرنا ہی پسند کی۔ طرفین کے ہزاروں مسلمانوں کے مارے جانے کے بعد جب انہوں نے اپنی شکست یقینی دیکھی تو نیزوں پر قرآن بلند کرا کے حضرت علی کی فوج میں انتشار پیدا کر دیا۔ اور اس کے نتیجے میں حضرت کی فوج میں ایک حصہ خوارج کے نام سے ظہور پذیر ہو گیا۔ جس کا نعرہ لا حکم الا اللہ تھا۔ یعنی اللہ کے حکم کے علاوہ کوئی حکم نہیں ہے۔ حضرت علی نے انہیں بہت سمجھایا کہ یہ ایک جنگی چال ہے امیر معاویہ قرآن پر ہرگز عمل نہیں کریں گے لیکن خوارج نے حضرت علی کو معاویہ کے ساتھ فیصلۂ حکمین پر مجبور کر دیا۔ امیر معاویہ کی طرف سے عمر عاص اور حضرت علی کی طرف سے ابو موسیٰ اشعری حکمین مقرر ہوئے۔ دونوں میں طے پایا کہ ابو موسیٰ حضرت علی کو اور عمر عاص امیر معاویہ کو معزول کر دیں اور کسی تیسرے شخص کو اپنا خلیفہ مقرر کر لیں۔

یہاں یہ بات خاص طور سے محلِ نظر ہے کہ ابو موسیٰ اشعری تو حضرت علی کو چوتھے خلیفہ کی حیثیت سے معزول کر رہے تھے لیکن عمر عاص امیر معاویہ کو کس منصب سے معزول کر رہے تھے۔ آیا چوتھی خلافت کے گورنر کی حیثیت سے یا چوتھی خلافت کی متوازی خلافت کے خلیفہ کی حیثیت سے، کیا کوئی محقق اس کی وضاحت کر سکتا ہے؟

بہرحال طے شدہ فیصلہ کے مطابق ابو موسیٰ اشعری نے حضرت علی کو خلافت سے معزول کر دیا لیکن عمر عاص نے اس معاہدہ کے برعکس امیر معاویہ کو معزول نہیں کیا۔ اس طرح یہ معاملہ بغیر کسی فیصلے کے کھٹائی میں پڑ گیا۔ معاویہ شام پہنچ گئے اور حضرت علی کوفہ آ گئے۔ امیر معاویہ نے شام پہنچ کر مملکتِ اسلامیہ کے مقبوضہ علاقہ مصر پر وہاں کے گورنر محمد بن ابی بکر کو شکست دے کر قبضہ کر لیا اور محمد بن ابو بکر کو زندہ پکڑ کر اور ایک گدھے کی کھال میں سلوا کر نذرِ آتش کر دیا۔ ام المومنین حضرت عائشہ کو جب اس واقعہ کی خبر ملی تو وہ اپنے بھائی کے غم میں نڈھال ہو گئیں اور پھر اپنی بقیہ زندگی کبھی گوشت نہیں کھایا۔ حضرت علی کو بھی اس انسانیت سوز حرکت سے بہت صدمہ پہنچا۔ امیر معاویہ نے اسی پر اکتفا نہیں کیا، انہوں نے بصرہ میں حضرت علی کے خلاف عام بے چینی اور بغاوت پھیلا دی جب اس بغاوت کو فرو کرنے کے لئے

حضرت علی کے سپہ سالار اور صحابی رسول حضرت مالک اشتر روانہ ہوئے تو راستہ میں انہیں زہر دلوا کر شہید کرا دیا۔ حضرت علی کو اس کا بھی بہت صدمہ ہوا۔ اُدھر خوارج کا گروہ جس نے حضرت علی کو حکمین کے فیصلہ پر مجبور کر دیا تھا اب خود حضرت کے خلاف دس ہزار کا لشکر لے کر مقام نہروان پر جمع ہو گیا۔ حضرت علی نے اس گروہ کو بھی جنگ سے اجتناب کرنے کی ہدایت کی مگر اس گروہ نے حضرت کی فوج پر حملہ کرکے پہل کر دی تو پھر حضرت کی فوج نے بھی جوابی کارروائی کی نتیجہ میں خوارج کا پورا لشکر ختم کر دیا۔ حضرت علی پھر کوفہ آ گئے۔ اِدھر امیر معاویہ نے تمام بلاد اسلامی اور مدینہ منورہ کی سرکردہ ہستیوں کو اپنی سیاسی اور مدبرانہ صلاحیتوں کی بنا پر اپنا ہموا کر لیا۔ بیت المال کو اپنی حکومت کے قیام کے لئے بے دریغ استعمال کیا۔ اِن کی یہ داد و دہش ان کے جود و سخا کے نام سے اس درجہ مشہور ہوئی کہ چھوٹے لوگوں کے علاوہ بڑے بڑے لوگ بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ خود حضرت علی کے سگے بھائی حضرت عقیل ابن ابی طالب جب اپنے بھائی سے اپنے استحقاق سے زیادہ نہ پا سکے تو وہ طلب دُنیا میں امیر معاویہ کے پاس شام پہنچ گئے۔ یہاں ان کی خوب آؤ بھگت ہوئی، ان کی امید سے زیادہ مال و متاع انہیں دیا گیا۔ اور جب ان سے یہ پوچھا گیا کہ تم نے علی کے مقابلہ میں مجھے کیسا پایا تو انہوں نے یہ تاریخی جواب دیا کہ دین کے معاملہ میں علی سے بہتر کوئی نہیں اور دنیا کے معاملہ میں تم سے بہتر کوئی نہیں۔

الغرض اسی طرح رائے عامہ کو ہموار کرتے ہوئے امیر معاویہ اپنی طاقت بڑھاتے رہے۔ اس کے برعکس حضرت علی نے کتاب خدا اور سنتِ رسول کی حدود سے کبھی تجاوز نہیں کیا۔ انہوں نے کبھی اپنی حکومت نہیں سمجھی۔ انہوں نے صرف خلافت کو حاکمیتِ الٰہی کے تحت رکھنے کی سعی کی، یہی وجہ ہے کہ ان کے زمانہ میں فتوحات کا سلسلہ نظر نہیں آتا۔ دوسری وجہ یہ کہ آپ کو اندرونی بغاوتوں سے اتنی فرصت ہی نہ ملی جو اور طرف توجہ دیتے۔ بہ ایں ہمہ آپ کے دورِ خلافت میں نظامِ حکومت کے لئے ایسے فرامین نظر آتے ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر آج بھی دنیا گہوارۂ امن بن سکتی ہے۔ باوجود اندرونی بغاوتوں کے آپ فروغِ علم و حکمت سے کبھی غافل نہ ہوئے۔ آپ کے خطبات کا مجموعہ نہج البلاغہ انسانوں کی ہدایت کے لئے آج بھی چراغِ راہ ہے۔ ۴۰ھ میں ایک بدبخت خارجی ابن ملجم نے آپ کو مسجد کوفہ میں شہید کر دیا۔ آپ کے بعد مسلمانوں

نے آپ کے بڑے صاحبزادے امام حسنؑ کو اپنا خلیفہ منتخب کرلیا۔

حضرت حسن ابن علی

مسلمانوں کے پانچویں خلیفہ تھے۔ آپ کا اسم گرامی حسن والد کا نام علی تھا۔ آپ رسول اللہ کے بڑے نواسے تھے۔

صورت وسیرت میں اپنے نانا سے مشابہ تھے، اور انسانیت کے درجۂ کمال پر فائز تھے۔ تمام اخلاق حسنہ سمٹ کر آپ کی ذات میں جمع ہو گئے تھے۔ ۴۰ھ میں حضرت علی کی شہادت کے بعد جب خلیفۃ المسلمین بنے تو آپ کی اُس وقت دُوہری حیثیت تھی۔ اپنے والد کی طرح آپ بھی بہ یک وقت اُس گروہ کے جو خلافت کو امر منجانب اللہ سمجھتا ہے دوسرے امام تھے، اور اُس گروہ کے جو خلافت کو من جانب الناس خیال کرتا ہے پانچویں خلیفہ تھے۔

ابھی آپ نے اُمور خلافت کی طرف توجہ مبذول بھی نہ کی تھی کہ امیر معاویہ نے ایک بڑی فوج کے ساتھ آپ پر حملہ کر دیا۔ آپ کے ساتھ بھی اگرچہ کافی مسلمان تھے لیکن اُن میں سے اکثر کو امیر معاویہ اپنے ساتھ ملا چکے تھے۔ اور یہ بات امام حسن سے پوشیدہ نہ تھی۔ پھر بھی آپ نے اس دفاعی جنگ کے مقابلہ کی تیاری کا ارادہ کرلیا۔ امیر معاویہ نے آپ کو صلح کی پیشکش کی، آپ نے حالات کا جائزہ لے کر اور مسلمانوں کو خون خرابہ سے بچانے کے لئے اس پیش کش کو منظور کرلیا۔

شرائط صلحنامہ کی تکمیل کے بعد آپ مسلمانوں کی خلافت سے تو دست بردار ہو گئے لیکن اپنے منصب امامت پر بدستور فائز رہے۔

صلحنامہ کی چند واضح اور خاص خاص شرائط درجِ ذیل ہیں۔

(۱) امیر معاویہ اُمور خلافت کتاب وسنت کے تحت انجام دیں گے۔

(۲) اپنے بعد اپنے بیٹے یزید کو خلافت نہیں دیں گے۔

(۳) حضرت علی پر تبرا بند کرا دیں گے۔

(۴) دوستانِ علی واہلبیت کو ظلم وستم کا نشانہ نہیں بنائیں گے۔

آپ یہ تحریری عہدنامۂ صلح لے کر کوفہ سے معہ اہلِ بیتِ رسالت مدینہ آ گئے۔ دس سال تک نہایت صبر سے زندگی گزار کر ۵۰ھ میں زہر دغا سے شہید کر دیئے گئے۔ آپ کی خواہش کے مطابق آپ کی میت کو پہلوئے رسولؐ میں دفن کرنے کے لئے جب آپ کے

اہلِ خاندان روضۂ رسولؐ پر لے گئے تو وہاں اُم المومنین حضرت عائشہ کے ایما پر مسلمانوں نے آپ کے جنازہ پر تیر برسا کر آپ کو روضۂ رسولؐ میں دفن نہ ہونے دیا۔ چنانچہ آپ جنت البقیع میں دفن کئے گئے۔

خلفاء بنی اُمیہ

امیر معاویہ بن ابوسفیان

مسلمانوں کے چھٹے خلیفہ تھے۔ نام معاویہ بن ابوسفیان کنیت ابو یزید تھی۔ یہ ابوسفیان کے چھوٹے فرزند تھے۔ فتح مکہ کے وقت مشرف بہ اسلام ہوئے۔ اُم المومنین حضرت اُم حبیبہ کے بھائی ہونے کی وجہ سے رسول اللہؐ کے برادرِ نسبتی بھی تھے۔ مسلمانوں کے ایک طبقہ نے اس نسبت سے ان کو خال المومنین کے خطاب سے بھی نوازا ہے یعنی مومنین کے ماموں۔ مگر تعجب ہے کہ اسی نسبت سے دیگر اُمہات المومنین کے بھائیوں کو اس خطاب سے کیوں محروم کیا گیا۔ کیا اس کی وجہ یہ خطاب دینے والے بتا سکتے ہیں۔ اور کیا اس خطاب دینے کی کوئی قرآنی نص بیان کر سکتے ہیں؟

یہ مروان بن الحکم کی طرح کاتبِ وحی بھی تھے۔ زمانۂ رسالت کی کسی جنگ میں ان کا کوئی کارنامہ نہیں ملتا۔ فہم و ذکا، جوڑ توڑ، سیاسی تدبر اور انتظامِ مملکت میں اپنا جواب آپ تھے۔ ۴۰ھ میں تختِ خلافت پر متمکن ہونے کے بعد انہوں نے اپنے حسنِ تدبر سے اپنے تمام مخالفین کو مختلف طریقوں سے کچل کر داخلی استحکام قائم کیا۔

ان کے دورِ خلافت میں مسلمانوں کی فتوحات کا دائرہ یورپ میں اسپین تک پہنچ گیا۔ افریقہ کا بیشتر علاقہ ان کے قبضہ میں تھا۔ بحری جنگوں کے لئے جہاز سازی کا کارخانہ انہوں نے ہی قائم کیا۔ فنِ تاریخ سازی اور فنِ حدیث سازی ان کے زمانہ میں ہی درجۂ کمال تک پہنچی۔ جس کے لئے انہوں نے بطورِ خاص اہتمام کرایا تھا۔ ہزاروں غلط تاریخی واقعات اور لاکھوں وضعی حدیثیں لوگ ایسی بیان اور تحریر کرنے لگے جن سے رسولؐ کا گنہ گار اور خطاکار ہونا ثابت ہو سکے۔ جن سے رسولؐ کے آباؤ اجداد کا فرد مشرک ہونا اور بنی اُمیہ کا پکا مسلمان اور جنتی

ہونا ثابت ہو سکے۔ جن سے اُمہات المومنین کا اخلاق باختہ ہونا ثابت ہو سکے۔ جن سے صحابہ کرام کا ظالم ہونا اور اُن کا رسولؐ سے بڑھا ہوا ہونا ثابت ہو سکے۔ جن سے اہلبیتِ رسولؐ کی توہین اور قرآنی احکام کی بے وقعتی ثابت ہو سکے۔ اگرچہ اِن لاکھوں احادیث میں سے بعد کے محدثین نے بڑی چھان بین کے بعد صرف چند ہزار احادیث کو اپنی کتب صحاح میں درج کیا ہے۔ لیکن اب بھی سینکڑوں احادیث اور تاریخی واقعات اِن کتبِ احادیث و تواریخ میں ایسے نظر آتے ہیں جو مندرجہ بالا حقائق کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں۔ اہلسنت کے ایک بڑے عالم جناب صائم حشتی صاحب نے اپنی کتاب ایمانِ ابوطالب میں ایسی بہت سی موضوعی احادیث کی نشاندھی کی ہے اور بردلائل ان کی رد کی ہے۔ یہاں صرف دو تین مثالوں پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے۔

ایک مشہور حدیث "مَن قَال لا اِلٰہ الا اللّٰہ وَجَبتُ لہٗ الجنۃ" ہے یعنی جس نے لا الہ الا اللہ کہہ دیا اس پر جنت واجب ہوگئی۔ یہ حدیث حضرت ابوہریرہ سے روایت کرتے ہوئے اس طرح بیان کی جاتی ہے کہ ایک روز مسجد نبوی میں حضور ختم المرسلینؐ نے ابوہریرہ کو حکم دیا کہ جاؤ اور مدینہ میں یہ اعلان کردو۔ حکمِ رسولؐ سے ابوہریرہ مدینہ کی گلیوں میں یہ اعلان کر رہے تھے کہ اُدھر سے حضرت عمرؓ آگئے، جب انہوں نے یہ اعلان سُنا تو ابوہریرہ کو مارا اور اِن کو اس اعلان سے روک دیا۔ ابوہریرہ مار کھا کر روتے ہوئے خدمتِ رسولؐ میں پہنچے اور حضرت عمر کی شکایت کرنے لگے کہ اتنے میں حضرت عمر بھی مسجد میں پہنچ گئے۔ رسول اللہؐ نے جب حضرت عمر سے ابوہریرہ کو مارنے اور اس اعلان کو روک دینے کی وجہ دریافت کی تو آپ نے جواب دیا کہ یا رسول اللہ یہ حکم تو ٹھیک ہے لیکن اس کے اعلان سے لوگ گمراہ ہو جائیں گے، اور عمل کرنا چھوڑ دیں گے۔ یہ سن کر رسول اللہ خاموش ہو گئے۔ گویا انہوں نے اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا کیونکہ انہوں نے پھر دوبارہ اس اعلان کا اعادہ نہیں کرایا اور نہ حضرت عمر سے ہی کچھ کہا۔

یہ واقعہ پڑھ کر اس کے کیا کیا نتائج برآمد ہوتے ہیں ذرا ملاحظہ کر لیجئے۔

۱۔ خدا اور اس کا رسول اس حکم کے اعلان کے مضر پہلو سے قطعی ناواقف تھے حضرت عمر نے دونوں کی اصلاح کر دی۔

۲۔ رسول اللہ نے حضرت عمر کے استدلال پر خاموشی اختیار کرکے اپنی غلطی کا

اعتراف کر لیا۔

۳۔ حضرت ابو ہریرہ یہ اعلان اپنی طرف سے نہیں کر رہے تھے بلکہ حکم رسول کی تعمیل کر رہے تھے لہٰذا وہ بے قصور تھے اور کسی کو بے قصور مارنا صریحاً ظلم ہے جس کے مرتکب حضرت عمر ہوئے۔ مزید یہ کہ انہوں نے حضرت ابو ہریرہ سے ان پر زیادتی کی معافی بھی نہیں مانگی۔

۴۔ ایک حاکم کے نقیب کو مارنا بالواسطہ حاکم کو مارنا ہے اور ابو ہریرہ اس وقت رسول اللہ کے نقیب کی حیثیت سے تھے۔

اگر مندرجہ بالا نتائج کو سامنے رکھ کر اس واقعۂ حدیث کو صحیح سمجھ لیا جائے گا تو پھر رسول اللہ کا امر دین میں غلطی کرنا اور حضرت عمر کا اس پر اصلاح کرنا۔ اور حضرت ابو ہریرہ کو بے خطا مار کر خود ان کا ظالم ہونا ثابت ہو جاتا ہے۔ اب اہلِ عقل و دانش جو چاہیں فیصلہ کریں انھیں اختیار ہے۔

ایک اور واقعہ اُم المومنین حضرت عائشہ کی نسبت سے صحیح مُسلم کے بابِ غسلِ جنابت میں مرقوم ہے کہ جب کسی اُمّتی نے حضرت عائشہ سے رسول اللہ کے غسل جنابت کے طریقہ کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے ایک باریک پردہ اُس کے اور اپنے درمیان حائل کر کے عملی طور سے اس کو طریقۂ غسل تبلایا۔ اس حدیث کی صحت پر یقین کرنے والے ذرا اس پر تو غور کریں کہ اُم المومنین کوئی معمولی درجہ کی عورت نہ تھیں۔ آپ ازروئے قرآن مومنین کی ماں ہیں اور عالمۂ قرآن بھی تھیں۔ کیا آپ قرآن کے ان احکام سے ناواقف تھیں جن میں ازواجِ رسول کو کسی نامحرم سے نرم گفتگو کرنے سے بھی منع کیا گیا ہو اور آپ خود ہی اس حکم کی خلاف ورزی کر کے اپنے برہنہ جسم کی نمائش کریں۔ علاوہ ازیں عقلی طور سے بھی عام عورتوں میں سے بھی کوئی بدکار سے بدکار اور بے حیا سے بے حیا عورت اپنے بیٹے کے سامنے اپنے برہنہ جسم کا مظاہرہ نہیں کر سکتی اور نہ کوئی بیٹا خواہ وہ کیسا ہی بدکار و بے حیا ہو اپنی ماں کو اس حالت میں دیکھنا گوارا کرے گا۔ چہ جائیکہ ام المومنین حضرت عائشہ جو مجسمۂ شرم و حیا تھیں اور جن کی پاکدامنی کی سند اللہ نے سورۂ نور میں دیدی ہے وہ ایسی حرکتِ ناشائستہ کا ارتکاب کرتیں جس سے رسول اللہ کو بھی سخت اذیت پہنچتی۔ لیکن راویانِ امیر

معاویہ نے اس فرضی واقعہ کو نقل کر کے ناموسِ رسالت کی توہین کے ساتھ رسول اللہ کو بھی اذیت پہنچائی ہے۔ یقیناً ایسی ہی سینکڑوں حدیثوں کو بنیاد بنا کر شردھانند کو رنگیلا رسول نامی کتاب لکھنے کی جرأت ہوئی۔ مسلمانوں نے بجائے اس کے کہ وہ ایسی حدیثوں کو موضوعی سمجھ کر اُن کی صحت سے انکار کرتے، شردھانند کو قتل کر کے اپنے جبر و تشدد کا مظاہرہ کیا۔

ایک واقعہ ام کلثوم اور حضرت عمر کے رشتۂ ازدواج کا تاریخ میں بہت مشہور ہے جس میں اکثر مورخین، حضرت عمر کو حضرت علی کا داماد بنا کر، توہینِ اہلبیتِ رسالت و اذیتِ رسول کا سبب بنے ہیں۔ نیز انہوں نے اس کوشش میں حضرت عمر کی شخصیت کو بھی داغدار کرنے سے اجتناب نہیں کیا ہے۔ یہ واقعہ تاریخ کے الفاظ میں ملاحظہ فرمایئے۔

تقریباً تمام کتبِ تواریخ میں یہ واقعہ مختلف طریقوں سے مرقوم دیکھا جاتا ہے جس کا لُبِّ لُباب یہ ہے کہ حضرت عمر نے حضرت علی سے اُن کی چھوٹی بیٹی اُم کلثوم کو اپنی زوجیت میں لینے کی خواستگاری کی (درآنحالیکہ آپ کی بڑی بیٹی حضرت زینب بھی ناکتخدا تھیں اور جو اپنی چھوٹی بہن سے دو سال بڑی تھیں اور خود جن کی عمر ۷ سال تھی اُن کے لئے خواستگاری نہیں کی) بہرحال حضرت علی نے بہ رضامندی یا بہ جبر و اکراہ ام کلثوم کو بنا سنوار کر حضرت عمر کے پاس دربارِ خلافت میں بھیج دیا۔ انہوں نے مجمع عام میں اُس بچّی کو جس کی عمر پانچ سال کی تھی، اپنے زانو پر بٹھایا۔ اُس کے بوسے لئے۔ اُس کی ران پر ہاتھ پھیرا، اور اپنے گھر بھیج دیا۔ اُس کی پرورش کرتے رہے جب وہ بالغ ہوگئی تو اس سے عقد کر کے اپنی زوجیت میں لے لیا، اور اس طرح وہ حضرت علی کے داماد ہو گئے۔ کسی تاریخ میں بھی ام کلثوم کا عقد دربار میں آنے سے پہلے نہیں لکھا ہے۔ اور نہ یہ تحریر ہے کہ ان کے عقد کا خطبہ کس نے پڑھا، شاید حضرت عمر نے خود ہی پڑھ لیا ہو۔ (تاریخ ابوالفدا اردو ترجمہ)

اگر یہ واقعہ درست مان لیا جائے تو مندرجہ ذیل نتائج برآمد ہوں گے۔

۱۔ حضرت عمر رسول اللہ کے خسر تھے اور اُم کلثوم رسول اللہ کی سگی نواسی تھیں۔ اس طرح اُم کلثوم حضرت عمر کی پرنواسی ہوئیں اور جن کی عمر تقریباً ۵ سال تھی۔ حضرت عمر نے اپنی پرنواسی کو اپنی زوجیت میں لینے سے قبل (جبکہ وہ شرعی طور سے اُن کے

لئے نامحرم تھی) بر سرِ عام بوس وکنار کر کے نہ صرف حدودِ شریعت کو توڑا بلکہ نہایت پست اخلاقی کا مظاہرہ کیا جو ایک عام آدمی بھی اپنی ہونے والی بیوی کے ساتھ نہیں کر سکتا۔

۲۔ اگر حضرت علی نے اپنی اس نابالغ لڑکی کو بہ رضامندی بغیرِ عقد حضرت عمر کے پاس بھیج دیا تو انہوں نے اپنی بچّی پر ظلم کرنے کے ساتھ حدودِ شریعت کو بھی توڑا۔

۳۔ اگر حضرت عمر نے اس بچّی کو بہ جبر وطاقت حضرت علی کی رضامندی کے بغیر حاصل کیا تو اس صورت میں حضرت عمر پست کردار اور حدودِ شریعت کو توڑنے والے کے علاوہ ظالم بھی ثابت ہوں گے۔

۴۔ ہر دو صورتوں میں حضرت عمر اور حضرت علی یا تو ظالم ومظلوم ہوں گے یا دونوں ظالم اور حدودِ شریعت کو توڑنے والے ثابت ہوں گے۔

حضرت عمر کو حضرت علی کا داماد بنا کر اُس کا ڈھنڈورا پیٹنے والے اور اُس پر یقین رکھنے والے جو بھی فیصلہ کریں انھیں اختیار ہے۔

اب ذرا حقیقتِ واقعہ پر بھی نظر ڈال لیجئے کہ نام کی یکسانیت سے رسول اور اُن کے اہلبیت وازواج وصحابہ کے دشمن مورخین بنی اُمیّہ نے بات کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔

جنگ موتہ میں حضرت جعفر طیّار کی شہادت کے بعد اسماء بنت عمیس جو حضرت علی کی سگی بھاوج تھیں، کا عقد حضرت ابوبکر سے ہوا تھا۔ اُن کے بطن سے حضرت ابوبکر کے دو بچّے محمد بن ابوبکر اور ام کلثوم بنتِ ابوبکر تھے۔ حضرت ابوبکر کے انتقال کے بعد اسماء بنتِ عمیس کا عقد حضرت علی سے ہو گیا تو حضرت ابوبکر کے یہ دونوں بچے ماں کے ساتھ حضرت علی کی زیرِ کفالت آگئے۔ حضرت عمر نے حضرت ابوبکر سے غایت درجہ محبّت کی بنا پر حضرت علی سے ان دونوں بچوں کو اپنی زیرِ کفالت لینے کی درخواست کی، حضرت علی کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے دونوں بچّوں کو اُن کے حوالے کر دیا۔ محمد نے جو سمجھ دار تھے اپنی رہائش حضرت علی کے ساتھ رکھنے پر اصرار کیا چنانچہ حضرت عمر نے اُن پر کوئی جبر نہیں کیا کہ وہ جہاں چاہیں رہیں۔ اُم کلثوم بنتِ ابوبکر ناسمجھ تھیں اُن کو

حضرت عمر نے پدرانہ محبت سے دربارِ عام میں زانو پر بھی بٹھایا اور بوسے بھی لئے اور اُن کو پرورش کے لئے اپنے گھر بھیج دیا، اور اُن کی پرورش اولاد کی طرح کی، اور یہ بات نہ تو کوئی عیب کی ہے، نہ شرم کی، اور نہ حدودِ شریعت سے تجاوز کرنے کی ــ بھلا ایک ساٹھ سال کا بزرگ جو حدودِ شریعت کی حفاظت کرنے والا خلیفۃ المسلمین بھی ہو وہ کس طرح ایک پانچ سال کی بچّی کو اپنی زوجہ بنانے کی جسارت کرسکتا ہے اور زوجہ بنانے سے پہلے غیر شرعی حرکات کا مرتکب ہو سکتا ہے؟

واضح رہے کہ حضرت علیؑ کی بڑی بیٹی حضرت زینب اور چھوٹی بیٹی حضرت ام کلثوم جو بطنِ جناب سیّدہ سے تھیں، کے عقد آپ کے دو بھتیجوں حضرت عبداللہ ابنِ جعفر طیّار اور حضرت محمد بن جعفر طیّار سے ہوئے تھے ــ آپ کی ایک بیٹی رقیہ جو بطنِ اُم البنین سے تھیں آپ کے ایک اور بھتیجے حضرت مسلم بن عقیل سے بیاہی گئی تھیں، اور یہ تینوں بیٹیاں واقعۂ کربلا کے بعد رسول اللہ کے اور دوسرے اہلِ حرم کے ساتھ اسیر ہو کر دربارِ شام میں لائی گئی تھیں۔

اسی طرح ان مورخین نے نام کی یکسانیت کی وجہ سے کسی اور سکینہ کے بجائے سکینہ بنتِ حسین کو زوجۂ یزید بنا کر اور اُس کو ایک رقاصہ اور مغنیّہ بنا کر توہینِ اہلبیت کے ساتھ خود یزید کے بھی لہو لعب اور رقص و سرود میں مبتلا رہنے کا اقرار کر لیا ہے۔ اللہ واکبر جس خانوادہ سے اسلام پھیلا ہو، جن کے گھروں میں ذکرِ الٰہی کے سوا کچھ نہ ہو، جو حسبِ قولِ رسول جوانانِ جنت کے سردار ہوں، اُن کی بیٹیاں رقص و سرود و گلوکاری میں ماہر ہو کر یزید کا دل بہلائیں ــ فاعتبروا یا اولی الابصار ــ یہ بے شرم راویانِ حدیث اور مورخینِ بنی اُمیہ خانوادۂ رسالت کے پاکیزہ افراد کو تو عیّاش، نفس پرور، حریص، لالچی، باغی، مُفسد اور گمراہ بتائیں اور حد یہ کہ خود رسولِ مقبول کو خاطی، گنہ گار، سہو و نسیاں کا مریض، کُنبہ پرور، راہِ عدل سے ہٹا ہوا، احکامِ خدا کی مخالفت کر کے اپنی خواہشِ نفس پر عمل کرنے والا بتائیں اور اُس کے مقابلہ میں بنی اُمیہ کے افراد کو پکّا مسلمان اور جنتی ثابت کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کر دیں، اُن کی فتوحات کو جو انہوں نے اپنے اقتدار کے لئے کیں جہاد اور عینِ اسلام بتائیں، اور مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ اِن کُتبِ تواریخ اور کُتبِ احادیث پر، قرآن سے

بھی زیادہ یقین رکھے، اور قرآنی آیتوں کے مقابلہ میں اِن وضعی احادیث کو زیادہ مستند سمجھے۔!

بہرحال ذکر تھا چھٹی خلافت کا ضمناً یہ بھی ذکر آ گیا۔ امیر معاویہ نے امام حسن سے جو معاہدۂ صلح کیا تھا اس کی کسی شرط کو بھی پورا نہ کر کے عہد شکنی کی ایسی مثال قائم کی ہے جس کی نظیر انسانی تاریخ میں مشکل ہی سے ملے گی۔

خدا کا حکم ہے کہ اپنے عہدوں کو وفا کرو۔ سنتِ رسول یہ کہ اگر کافر سے بھی معاہدہ کیا جائے تو اس کی پابندی لازمی ہے مگر عملِ امیر معاویہ اس کے برعکس۔ پہلے ہی مرحلہ پر کتاب وسنت کے جامہ کو تار تار کر دیا۔ دوسرے امورِ خلافت میں کتاب وسنت پر کس کس طرح عمل ہوا تمام تاریخیں اس کی گواہی کے لئے کافی ہیں۔

معاہدہ کی دوسری شرط اپنے بعد اپنے بیٹے یزید کو خلیفہ نہ بنانے کی تھی مگر انہوں نے اس شرط کی بھی خلاف ورزی کرتے ہوئے یزید کو اپنا جانشین مقرر کر دیا۔

معاہدہ کی تیسری شرط جمعہ کے خطبہ میں منبروں پر حضرت علی کے اوپر تبرّا بند کرانا تھا۔ انہوں نے اس شرط کی بھی خلاف ورزی کرتے ہوئے نہ صرف یہ کہ اپنے زمانہ تک رسمِ تبرّا کو جاری رکھا۔ بلکہ ان کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیز کے اوائل دورِ خلافت تک حضرت علی پر تبرّا ہوتا رہا۔ مشہور صحابی رسول حضرت حجر بن عدی مع اپنے ساتھیوں کے اِن کے ہی حکم سے محض اس جرم میں شہید کر دیئے گئے کہ انہوں نے حکمِ خدا اور حکمِ رسول کی اطاعت کرتے ہوئے حضرت علی پر تبرّا نہیں بھیجا تھا۔

معاہدہ کی چوتھی شرط کی خلاف ورزی اس طرح کی کہ دوستانِ رسول اور آلِ رسول پر اور بھی عرصۂ حیات تنگ کر دیا۔ تمام عمّال کو یہ سرکاری فرمان جاری کر دیا کہ دوستیٔ علی وآلِ رسول کا جس پر بھی شبہ ہو جائے اس کا روزینہ بند کر دیا جائے اور اس کو طرح طرح سے پریشان کیا جائے چنانچہ لوگ محبتِ آلِ رسول کا برملا اظہار بخوفِ جان ومال نہیں کر سکتے تھے۔ مشہور صحابی رسول حضرت عمّار یاسر، اویس قرنی اور بہت سے دوسرے صحابہ جنگِ صفین میں حضرت علی کے ساتھ تھے اور وہ معاویہ کی فوج کے ہاتھوں درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔ ان ہی کے زمانہ میں مروان بن الحکم کو دوبارہ مدینہ کا گورنر بنا کر بھیجا گیا، اور اسی طرح اُن تمام بدکردار

اور ظالم عمال کو جن کو حضرت علی نے اپنے دورِ خلافت میں معزول کر دیا تھا دوبارہ انھیں مناصب پر بحال کر دیا گیا جن پر وہ زمانۂ حضرت عثمان میں فائز تھے۔ اِن لوگوں نے امیر معاویہ کی حکومت کے استحکام کے لئے کسی بھی غیر شرعی کام سے گریز نہیں کیا۔

کم و بیش ۲۵ سال تک شام کے مطلق العنان حکمران کی حیثیت سے اور تقریباً ۲۰ سال تک پورے بلادِ اسلام کے خلیفہ کی حیثیت سے گویا تقریباً ۴۵ سال تک اپنے اقتدار کی بہار دیکھ کر جب مسلمانوں کے یہ عظیم الشان خلیفہ دنیا سے رخصت ہونے لگے تو اپنے بیٹے یزید کو جو تحریری وصیت لکھوائی ہے وہ صاحبانِ عقل و بصیرت کے لئے یقیناً باعثِ عبرت ہے۔ آپ تحریر فرماتے ہیں۔

"اے فرزند، میں نے تیری راہ کے سارے کانٹے دور کر کے تیرے لئے راہ ہموار کر دی ہے۔ سارے عرب کی گردنوں کو تیرے لئے خم کر دیا ہے۔ تیرے لئے، مال و دولت کے خزانے اکٹھا کر دیئے ہیں، تاکہ تو اطمینان سے حکومت کر سکے۔ لیکن ان چند اشخاص سے ہوشیار رہنا کہ یہ تیرے لئے باعثِ خطرہ ہو سکتے ہیں۔ سب سے زیادہ حسین ابن علی، اگر تو اِن پر قابو پائے تو اِن سے نرمی کا برتاؤ کرنا۔ دوسرا عبد اللہ بن زبیر کہ یہ لومڑی کی چال چلنے والا ہے، اس پر قابو حاصل ہو تو ذرّہ برابر رحم نہ کرنا۔ تیسرے عبد اللہ ابنِ عمر اور چوتھے عبد الرحمن بن ابو بکر، لیکن اِن آخر الذکر دونوں افراد سے زیادہ خطرہ نہیں ہے۔"

(تاریخ اسلام۔ سید عین الحق)

اب ذرا، اس وصیت پر غور فرمایئے، امیر معاویہ انسانوں کے سر بجائے خدا کے آگے سرنگوں کرانے کے اپنے نامور صاحبزادے یزید کے آگے جھکوا رہے ہیں یعنی حاکمیتِ الٰہی کے بجائے انسانی اقتدار قائم کر رہے ہیں۔

اللہ نے قرآن میں مال و دولت جمع کرنے کی سختی سے ممانعت کی ہے اور سنتِ رسول یہ ہے کہ انہوں نے کبھی مال کو بیت المال تک میں جمع نہ کیا، لیکن امیر معاویہ کتاب و سنت دونوں کے خلاف مال جمع فرماتے ہیں، اس پر بھی وہ ہیروز آف اسلام میں شمار کئے جاتے

ہیں۔ کیا ایسے ہی اشخاص کو اولی الامر میں شمار کیا جائے گا؟ کیا اللہ نے ایسے ہی لوگوں کی اطاعت اور پیروی کا حکم قرآن میں دیا ہے؟ کیا ایسے ہی افراد "اصحابی کالنجوم" میں شامل ہو سکتے ہیں؟ کیا ایسے ہی صحابہ "کلھم عدول" کے زمرہ میں آ کر اس حدیث کا مصداق بن سکتے ہیں؟ ان تمام باتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ احادیثِ مندرجہ بالا احکام قرآن کے متضاد اور آیاتِ قرآنیہ سے متصادم ہیں اور قطعی موضوعی ہیں، اور یہ زمانۂ بنی اُمیّہ کی کسی حدیث ساز فیکٹری کی بنا کردہ ہیں۔

اہلِ عقل و بصیرت جو بھی فیصلہ کریں اُس کے جوابدہ وہ خود ہوں گے، قیامت میں کوئی شخص کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا، ہر شخص خود ہی اپنے عقیدہ اور اعمال کا ذمہ دار ہوگا۔

یزید بن معاویہ مسلمانوں کے ساتویں خلیفہ تھے۔ نام یزید والد کا نام معاویہ بن ابو سفیان کنیت ابو خالد تھی۔ ۶۰ھ میں اپنے والد کے انتقال کے بعد اُن کی وصیت کے مطابق تختِ خلافت پر بیٹھے۔ سیرت و کردار کے لحاظ سے اپنے باپ دادا کی صفات کے اعلیٰ نمونہ تھے۔ البتہ حکومتی سیاست میں اپنے والد کی طرح ہوشیار نہ تھے اور بہت ناتجربہ کار تھے مگر اس کمی کو اپنے والد کے مشیروں، عُمرو عاص، مغیرہ بن شعبہ، مروان بن الحکم اور زیاد بن سمیّہ جیسے ماہرینِ سیاست کو اپنا سرپرست بنا کر پورا کر لیا تھا۔ سیاسی قابلیت کی کمی کا سبب یہ تھا کہ یہ اپنے زمانۂ ولی عہدی میں رقص و سرود، شعر و شاعری، سیر و تفریح، لہو و لعب اور شکار کے بہت دلدادہ تھے۔ شکار کے لئے بہترین نسل کے کتے بھی پال رکھے تھے۔ اپنے والد کی وفات کے وقت بھی یہ دمشق میں موجود نہ تھے کہیں شکار کھیلنے باہر گئے ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے باپ نے اپنا وصیت نامہ تحریری صورت میں دیا جو آج بھی کتابوں میں درج ملتا ہے، ورنہ یہ باتیں تو زبانی اور سینہ بسینہ ہی ہوتی ہیں۔ باپ کی وصیت اور اُن کی دلی خواہش کے مطابق حکومت و اقتدار ہمیشہ اپنی نسل میں باقی رکھنے اور اس انسانی حکومت و اقتدار کو عین اسلام بنا کر دنیا کے سامنے پیش کرنے اور اُسے مصدّقہ بنانے کے لئے انہوں نے سب سے پہلے خانوادۂ رسالت کے تیسرے ہادی حسین ابن علی سے بیعت طلب کی اور گورنر مدینہ کو فرمان جاری کیا کہ اگر حسین بیعت نہ کریں تو انہیں قتل کر دینا۔ امام حسین نے بیعت سے انکار کرتے ہوئے مدینہ سے مکہ ہجرت فرمائی۔ مکہ میں بھی جب ان کے قتل کے لئے حاجیوں کے بھیس میں

شامی سپاہی آگئے تو آپ نے مجبوراً حج سے ایک دن پہلے صرف عمرہ کر کے عراق کی جانب سفر شروع کر دیا۔ اس سے قبل کوفیوں کے بلاوے پر آپ نے حضرت مسلم بن عقیل کو اپنا سفیر بنا کر کوفہ بھیج دیا تھا۔ اثنائے سفر میں آپ کو حضرت مسلم کی خبرِ شہادت ملی۔ آپ نے سفر جاری رکھا، جب آپ کوفہ کے قریب پہنچے تو یزیدی لشکر کے ایک سردار حُر نے مزاحم ہو کر آپ کو کربلا کے میدان میں پہنچا دیا۔ یہاں مزید یزیدی افواج نے آ کر آپ کو محاصرہ میں لے لیا۔ تین دن تک آپ پر اور آپ کے بچوں اور اعزاء و انصار پر پانی بند رکھا۔ ۱۰ محرم روزِ عاشورہ تقریباً ۷۲ افراد کو جن میں بوڑھے بچے و جوان سب شامل تھے مع ان کے سردار حسینؑ بن علیؑ کے نہایت بیدردی سے بھوکا پیاسا ذبح کر دیا۔ بعدہٗ رسول اللہ کی نواسیوں، بہوؤں اور اُن کے بچوں اور تمام دیگر عورتوں کو اسیر کر کے پہلے دربارِ کوفہ، پھر دربارِ شام میں لے گئے۔ جب یہ اسیران اہلِ حرم شام کے دربارِ عام میں پہنچے تو خلیفۃ المسلمین یزید نے فی البدیہہ کچھ اشعار ارشاد فرمائے جس کا مطلب کچھ اس طرح ہے کہ کہاں ہو شہدائے بدر و اُحد اگر آج تم ہوتے تو دیکھتے کہ ہم نے کس طرح بنی ہاشم سے تمہارا انتقام لیا ہے۔ اور بنی ہاشم نے تو حصولِ سلطنت کے لئے ایک کھیل بنایا تھا نہ اُن پر وحی آتی تھی نہ کوئی فرشتہ آتا تھا۔ اس طرح مندرجہ بالا مفہوم کو اشعار کی صورت میں ادا کر کے اس نے بنی اُمیہ کے اُن عقائد اور مقاصد کا برملا اظہار کر دیا جس کے علی الاعلان اظہار سے ان کے آباؤ اجداد گریز کرتے رہے تھے۔ جو کام اِن کے جد، ابوسفیان اور اِن کے والد امیر معاویہ قبولِ اسلام سے قبل زمانۂ جاہلیت میں انجام نہ دے سکے تھے اب اسلام کی آڑ لے کر اِنہوں نے انجام دے دیا۔ اس کے بعد اس نے اسیروں کی طرف مخاطب ہو کے فرمایا۔

"اللہ کا شکر ہے کہ اُس نے تمہیں ذلیل و رسوا کیا اور ہمیں عزت و حکومت عطا کی۔"

اس پر کربلا کی شیر دل خاتون جناب زینب اور بیشۂ نجف کے شیر سید سجادؑ نے اپنے جوابی خطبوں سے ایوانِ حکومت کو متزلزل کر دیا۔ خلیفہ نے گھبرا کر آلِ محمد کو ایک تنگ و تاریک قید خانہ میں مقید کر دیا۔ تاریکیٔ زنداں سے گھبرا کر جب حسین ابن علی کی ایک پانچ چھ سالہ بچّی سکینہ درِ زنداں پہ آجاتی تو شامی بچے تماشہ دیکھنے درِ زنداں کے باہر کھڑے ہو جاتے۔ اور جب یہ بچّی اپنے اور اپنے اہلِ خاندان پر ہونے والے مظالم کو نہایت دردانگیز پیرائے میں

بیان کرتی تو شامی بچے بہت متاثر ہوتے، پھر وہ اپنی ماؤں کو جاکر یہ حال سناتے، شامی عورتیں تصدیقِ حال کے لئے سکینہ کے پاس آتیں اور جب انہیں یہ معلوم ہوتا کہ یہ قیدی آلِ رسولؐ ہیں تو وہ جاکر اپنے مردوں کو غیرت دلاتیں اور اس طرح شامی مرد و عورتوں میں یزید کے خلاف جذبۂ نفرت بیدار ہونے لگا۔ اور جب ایک دن ان شامیوں کو یہ معلوم ہوا کہ وہ بچی بے کسی کی حالت میں قید خانے کے اندر ہی انتقال کر گئی ہے تو انہوں نے یزید کے خلاف اپنے جذبۂ نفرت کا اظہار علی الاعلان شروع کر دیا۔ خلیفہ نے جب یہ دیکھا کہ اُس کے ہی آدمی اُس کے ہی دار الخلافہ میں بغاوت پر آمادہ ہیں تو اس نے بدرجۂ مجبوری تقریباً ایک سال تک آلِ محمدؐ کو قید رکھنے کے بعد رہا کر کے مدینہ پہنچا دیا۔ جب اہلِ مدینہ کو اِن روح فرسا واقعات کا علم ہوا تو انہوں نے خلیفۂ وقت کے خلاف اعلانِ بغاوت کر دیا۔ اس بغاوت کو فرو کرنے کے لئے خلیفہ نے ایک فوج مدینہ بھیج دی جس نے اہلِ مدینہ کے قتلِ عام کے ساتھ ہزاروں عوراتِ مدینہ کی عصمت دری سے بھی گریز نہیں کیا، مسجد نبوی میں گھوڑے باندھ کر اور اس میں گندگی پھیلا کر اُن فوجیوں نے اپنے پکے مسلمان ہونے کا ثبوت دیا۔ تاریخ میں اس واقعہ کو واقعۂ حرّہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

اس حادثہ کے کچھ عرصہ بعد مکہ میں عبد اللہ ابنِ زبیر اپنی خلافت کا اعلان کر کے یزید کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ یزید نے ایک بڑی فوج مسلم بن عقبہ کی ماتحتی میں عبد اللہ ابنِ زبیر کی سرکوبی کے لئے مکہ روانہ کی۔ راستہ میں مسلم بن عقبہ کی موت واقع ہو گئی تو سرداریٔ لشکر حصین[۱] ابن نمیر کو تفویض کی گئی۔ اس نے مکہ پہنچ کر عبد اللہ بن زبیر کی فوج پر حملہ کر دیا، اور خانۂ کعبہ پر سنگباری کرا کے اور پھر آگ برسا کر حرمتِ خانۂ کعبہ کو زائل کیا۔ ابھی یہ حملہ

---

[۱] حصین ابنِ نمیر وہی شخص ہے جس نے کربلا میں شبیہہ رسولؐ علی اکبر کو برچھی مار کر شہید کیا تھا، اور جب شکست کھا کر بھاگا تو راستہ میں بھوک سے نڈھال ہو کر سیّد سجاد سے پناہ کا طالب ہوا۔ آپ نے انسانی شرافت کا اپنا آبائی خاصہ دکھا کر اُس کی اس حالت میں مدد کی جو خانوادۂ رسالت کے علاوہ کسی سے ممکن نہ تھی۔

جاری تھا کہ یزید کی موت کی خبر آگئی ۔ شامی فوج گھبرا گئی ۔ عبداللہ ابن زبیر نے موقع غنیمت دیکھ کر شامیوں پر ایک بھرپور حملہ کیا اور اُن کو شکست فاش دی ۔ سردارِ لشکر حصین ابن نمیر جان بچا کر بھاگ گیا اور اس طرح عبداللہ بن زبیر کا پورے حجاز پر تسلط ہو گیا۔

ساتویں خلیفۃ المسلمین یزید بن معاویہ کا تین سالہ دورِ خلافت اندرونی خلفشار میں گزرا۔ اس نے آلِ محمد کو تاراج کر کے یہ خیال کیا تھا کہ اب حکومت مستحکم ہو گئی ہے، لیکن یہی واقعہ زوالِ بنی اُمیہ کا باعث ہوا۔

مسلمانوں کا ایک طبقہ ان کو خلیفۂ برحق خیال کر کے حسین ابنِ علی کو باغی، خاطی وحریصِ جاہ قرار دے کر اُن کے قتل کو جائز سمجھتا ہے اور دلیل یہ دیتا ہے کہ چونکہ خلیفۂ یزید استحقاقِ خلافت کے مسلمانوں کے مقرر کئے ہوئے چاروں اصول (اجماع، استخلاف، شوریٰ اور قہر و غلبہ) پر پورے اترتے ہیں لہذا ان کی خلافت برحق ہے اور اُن کے مقابلے میں جو آئے وہ باغی اور واجب القتل ہے ۔ اگر اس طبقہ کی اس دلیل کو مان لیا جائے تو پھر یہی جرم عبداللہ بن زبیر سے بھی سرزد ہوا ہے ۔ اس کے علاوہ حضرت طلحہ و زبیر و امیر معاویہ و حضرت عائشہ پر بھی اس کا اطلاق ہو گا کہ انہوں نے مسلمانوں کے مسلمہ چوتھے خلیفۂ راشد کے خلاف جنگ کی ۔ آخر اصول بھی کوئی چیز ہے کہ نہیں ۔ ؟ امام حسین نے تو یزید کے خلاف کسی فوج کو ساتھ لے کر حملہ نہیں کیا تھا صرف اس کی بیعت سے انکار کیا تھا اگر اُن سے مطالبۂ بیعت نہ کیا جاتا تو وہ بھی اپنے والد اور اپنے بھائی کی طرح اپنی زندگی پُر امن طور سے بسر کر لیتے اور اس مظلومی کی حالت میں اپنی جان نہ دیتے ۔ نہ اپنے اہلِ خاندان اور اصحاب کو قتل ہوتا ہوا دیکھتے ۔ نہ اپنے اہلِ حرم کا اسیر و مقیّد ہونا گوارا کرتے ۔ اس پر بھی یہ طبقہ اپنی ہٹ دھرمی سے اُن کو باغی قرار دے تو اس کا سبب اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اس طبقہ کو اسلام، بانیٔ اسلام اور اُس کے اہلبیت ہی سے دشمنی ہے ۔ اگرچہ یہ طبقہ اسلام اور بانیٔ اسلام سے بہ ظاہر اور بہ مصلحت اپنی والہانہ عقیدت کا اظہار کرتا ہے لیکن بہ باطن اس کا ہدف اسلام اور بانیٔ اسلام ہی ہیں۔

ہم نے ان سات خلافتوں کا تذکرہ ذرا تفصیل سے اس لئے بیان کیا ہے کہ یہ ساتوں خلفاء رسول اللہ سے قرابتِ قریبہ رکھتے تھے۔ پہلے اور دوسرے رسول اللہ کے خسر تھے۔

تیسرے اور چوتھے مسلمانوں کے ایک طبقہ کے مطابق رسول اللہ کے داماد تھے۔ پانچویں رسول اللہ کے نواسے تھے۔ چھٹے رسول کے برادر نسبتی (سالے) تھے اور ساتویں رسول کے سالے کے لڑکے تھے۔

اس تفصیل کی دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ یہی ساتوں خلافتیں مسلمانوں کے درمیان مابہ النزاع ہیں۔ خصوصاً ساتویں خلافت۔ لیکن یزید بن معاویہ کا وجود ساتویں خلیفہ کی حیثیت سے ایک تاریخی حقیقت ہے اور اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

یزید کی وفات کے بعد جب اہلِ خاندان نے اُن کے صاحبزادے حضرت معاویہ بن یزید کو خلیفہ بنانا چاہا تو انہوں نے تختِ خلافت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ "میرے دادا نے یہ تختِ خلافت حضرت علی کا حق چھین کر ظُلم سے حاصل کیا تھا۔ میرے باپ نے اسی تخت خلافت سے خاندانِ رسالت کو تاراج کیا ہے لہذا میں اس پر تھوکر مارتا ہوں۔ جس کو چاہو اپنا خلیفہ بنالو۔"

مندرجہ بالا خطبہ کی صورت میں انہوں نے اپنے باپ دادا کے کارناموں کے مکروہ چہرہ پر ایسا بھرپور طمانچہ مارا ہے جس کا نشان قیامت تک تاریخ کے ہر دور میں نمایاں رہے گا۔ حامیان بنی اُمیہ ایسی ہزار کوششوں کے بعد بھی اس نشان کو مٹانے میں کامیاب نہ ہوں گے۔ کیونکہ ایک بیٹے اور ایک پوتے کی اپنے باپ اور دادا کے خلاف گواہی اوروں کے مقابلہ میں زیادہ مستند سمجھی جائے گی۔ اس مردِ حق گو اور حق پرست نے اپنے باپ دادا کے اس منصوبہ کو خاک میں ملادیا جو انہوں نے سلطنت و اقتدار ہمیشہ اپنے خاندان میں باقی رکھنے کے لئے بنایا تھا۔ معاویہ بن یزید کے اس کارنامہ کے بعد نسلِ ابوسفیان سے حکومت و اقتدار کا ہمیشہ کے خاتمہ ہوگیا۔ خدا کی شان ہے کہ ایسے دشمنانِ اسلام کے گھر ایسا شیدائے حق پیدا ہوا جس نے دنیاوی جاہ و جلال کے بدلے آخرت کو زیادہ پسند کیا۔ لیکن اس حق گوئی اور حق پرستی کے جرم میں اُس کے اہلِ خاندان نے اُس کو زندہ درگور کر دیا اور وہ شہیدِ راہِ حق ہو کر منصبِ شہادت پر فائز ہوا۔

مروان بن الحکم مسلمانوں کے آٹھویں خلیفہ تھے۔ نام مروان والد کا نام حکم۔

خاندانِ بنی اُمیّہ سے تعلق تھا۔ حضرت عثمان۔ کے چچازاد بھائی تھے۔ زمانۂ خلافتِ حضرت عثمان میں اُن کے وزیرہ کراُن کی حکومت کی تباہی کا باعث ہوئے، دَورِ خلافتِ امیر معاویہ میں دوبارہ مدینہ کے گورنر بنائے گئے۔ دَورِ یزید بن معاویہ میں ولید بن عقبہ گورنر مدینہ کے مشیر کی حیثیت سے مدینہ میں ہی رہے۔ انہوں نے ولید بن عقبہ کو مشورہ دیا تھا کہ اگر حسین بیعت نہ کریں تو ان کو مدینہ میں ہی قتل کردیا جائے۔ ۶۴ھ میں یزید بن معاویہ کے بعد آٹھویں خلیفۃ المسلمین کی حیثیت سے تختِ خلافت پر بیٹھے۔ اِن کے دور میں عبداللہ بن زبیر نے حجاز و عراق اور شام کے علاقہ پر قبضہ کر کے سلطنتِ بنی اُمیّہ کا چراغ ہمیشہ کے لئے گل کردینا چاہا تھا لیکن مروان کی خوش قسمتی سے انہیں شکست ہوئی، اور ساتھ ہی ساتھ مروان بھی راہیٔ ملک عدم ہوئے۔ اِن کے دَورِ حکومت میں بنی اُمیّہ پر چاروں طرف سے زوال آنا شروع ہوگیا تھا لیکن ان کے فرزند عبدالملک بن مروان نے اس کو سنبھالا دیا۔

عبدالملک بن مروان

مسلمانوں کے نویں خلیفہ تھے۔ یہ مروان کے بڑے صاحبزادے تھے۔ ایک جوان عزم و ہمت کے مالک اور بہت نڈر اور مدبّر تھے۔ انہوں نے عبداللہ بن زبیر کو شکست دے کر اور پھر انہیں قتل کر کے شام و حجاز و عراق پر دوبارہ قبضہ کرلیا۔ اِن کے سپہ سالار اور مشیر حجاج بن یوسف نے اپنی سخت گیری کی بنا پر استحکامِ حکومتِ بنی اُمیّہ میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ مورخین کے اندازے کے مطابق تقریباً ڈھائی لاکھ مسلمانوں کو قتل کر کے بنی امیہ کی دھاک بٹھادی۔ اِن ہی کے عہدِ حکومت میں انتقام خونِ حسینؑ لینے کے لئے توابین لڑے۔ اسی خونِ حسینؑ کا انتقام مختار ثقفی نے تمام قاتلانِ حسینؑ کو قتل کر کے لیا، اور ابنِ زیاد اُن کے ہاتھوں اپنے کیفرِ کردار کو پہنچا۔ عبدالملک نے ایک سیاسی چال چلتے ہوئے عبداللہ بن زبیر کے بھائی مُصعب بن زبیر حاکم بصرہ کو مختار ثقفی سے لڑا کر دونوں کی طاقتیں ختم کردیں اور اس طرح ان کو ابنِ زبیر پر قابو حاصل ہونے میں زیادہ دقت پیش نہیں آئی۔

اِن کے دَورِ حکومت میں اسلامی سکّہ کا رواج ہوا۔ قرآن پر اعراب لگائے گئے اور عربی کو سرکاری زبان قرار دیا گیا۔ ۶۵ھ سے ۸۶ھ تک تقریباً ۲۱ سال بڑے دبدبے سے حکومت کی۔

ولید بن عبد الملک مسلمانوں کے دسویں خلیفہ تھے۔ ۸۶ھ میں اپنے باپ کی وفات کے بعد حکومت ہاتھ آئی۔ داخلی استحکام باپ کر چکے تھے لہذا فتوحات کا سلسلہ جاری ہوا۔ چینی ترکستان، سندھ، اسپین اور کچھ رومی علاقے فتح ہوئے، مسلمانوں کی حدودِ سلطنت ان کے زمانہ میں کافی بڑھ گئی تھی۔ باپ کے زمانہ کے سپہ سالار افواج حجاج بن یوسف نے اِن کی بھی مدد کی۔ دس سال تک اطمینان سے حکومت کر کے رحلت کر گئے۔

سلیمان بن عبد الملک مسلمانوں کے گیارہویں خلیفہ تھے۔ ۹۶ھ میں اپنے بھائی کی وفات پر سریر آرائے تختِ خلافت ہوئے۔ منتقلیٔ اقتدار کے سلسلہ میں چونکہ سردارانِ فوج، حجاج بن یوسف، قتیبہ بن مسلم اور موسیٰ بن نصیر نے سلیمان کے بجائے ولید کے بیٹے کو خلیفہ نامزد کرانا چاہا تھا، لہذا اس نے برسرِ اقتدار آتے ہی اِن نامور فاتحین کو ان کے کیفر کردار تک پہنچایا، جنہوں نے لاکھوں انسانوں کو قتل کرا کے حکومت بنی اُمیہ کو مضبوط بنایا تھا۔ اِن کے دورِ خلافت کا اہم واقعہ قسطنطنیہ پر فوج کشی تھی جس میں ناکامی کی صورت میں لاکھوں مسلمان کام آئے اور مصائب میں مبتلا ہوئے اِسی دوران اِن کا انتقال ہو گیا، اور اِن کی وصیّت کے مطابق بارِ خلافت حضرت عمر بن عبد العزیز کے کاندھوں پر آیا۔

عمر بن عبد العزیز مسلمانوں کے بارہویں خلیفہ تھے۔ سلیمان کے بعد ۹۹ھ میں جب حضرت عمر بن عبد العزیز سریر آرائے تختِ خلافت ہوئے تو خلفاءِ بنی اُمیہ کے برعکس آپ نے خلافت کو حاکمیتِ الٰہی کے تابع کرتے ہوئے درج ذیل اقدامات فرمائے۔

۱۔ اپنی زندگی پیروئ رسول کرتے ہوئے نہایت سادگی سے بسر کی۔
۲۔ بیت المال کو مسلمانوں کا حق سمجھتے ہوئے اپنے ذاتی استعمال میں نہیں لائے۔
۳۔ غصب شدہ مال و املاک جو آپ کے آباء و اجداد اور دیگر خلفاء نے مختلف الزامات کے تحت لوگوں سے چھین کر اپنے پسندیدہ افراد میں تقسیم کر دیئے تھے، وہ

واپس لے کر آپ نے اُن کے اصل مالکوں تک پہنچایا۔ اور اس سلسلہ میں آپ کا سب سے بڑا کارنامہ ردِّ فدک ہے۔ باغِ فدک جو پہلی خلافت میں رسول کی بیٹی کی ملکیت سے نکال کر بحق حکومت ضبط کر لیا گیا تھا اور تیسری خلافت میں حضرت عثمان نے اُس کو اپنے داماد کو بخش دیا تھا، اور جب سے وہ ان کی اولاد میں وراثتاً چلا آرہا تھا۔ آپ نے اُن سے لے کر اُسے امام محمد باقرؑ کو واپس کیا۔

۴۔ حضرت معاویہ نے جو رسمِ تبرّا حضرت علی پر جاری کی تھی، جس کی پابندی ہر نماز جمعہ میں خطبہ سے پہلے لازمی تھی اور جس کا فرمان بلادِ اسلامیہ کے ہر عامل اور گورنر کو جاری کر دیا گیا تھا، اور یہ تبرّا اتنا لازمی تھا کہ لوگ اِس کو جزوِ نماز سمجھنے لگے تھے۔ آپ نے نہایت دانائی سے اس رسمِ بد کو بند کرا دیا۔

۵۔ دوستانِ آلِ محمد پر جو سختیاں خلفاءِ ماسبق کے زمانہ میں ہوتی رہیں وہ بند کر دیں جس سے انہوں نے کچھ سکون کا سانس لیا۔ اسی طرح بہت سے اُمورِ غیر شرعیہ کو بھی بند کرا کے لوگوں کو حاکمیتِ الٰہی قبول کرنے کی تلقین کرتے رہے۔ لیکن بنی اُمیّہ نے اُن کو اس حق پرستی کے جرم میں زہر دغا سے شہید کر دیا۔ مورخوں نے آپ کے دورِ خلافت کے واقعات لکھتے ہوئے ایک حیرت انگیز اجتماعِ ضدّین پیش کیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ

حضرت عمر بن عبدالعزیز کے پیشرو خلفاء جنہوں نے یہ حق تلفیاں کی تھیں وہ بھی اولی الامر اور حق پر اور حضرت عمر بن عبدالعزیز بھی اولی الامر اور حق پر، جنہوں نے اِن تمام حق تلفیوں کا ازالہ کیا۔! اگر کوئی فلسفی یا کوئی منطقی یا ماہر قانون یا صائب الرائے دانشور یا کوئی دیانت دار مورخ اس گتھی کو سلجھا دے تو وہ یقیناً عین الحق کہے جانے کا مستحق ہو گا۔

حضرت عمر بن العزیز کی شہادت کے بعد عبد الملک بن مروان کے دو اور بیٹے یزید ثانی اور ہشام سریر آرائے تختِ خلافت ہوئے جن کا دور بالترتیب ۱۰۱ھ تا ۱۰۵ھ اور ۱۰۵ھ تا ۱۲۵ھ رہا۔ اِن کے زمانہ میں داخلی انتشار بڑھ گیا۔ چاروں طرف اس استبدادی حکومت کے خلاف آوازیں بلند ہونے لگیں جس نے پھر سے دورِ بنی اُمیّہ کے مظالم کو تازہ کر دیا تھا۔ اور جو عمر بن عبدالعزیز کے دور میں دب گیا تھا۔ چنانچہ امام حسینؑ کے پوتے زید شہید بن سید سجادؑ

نے خلافت بنی اُمیہ کے خلاف باقاعدہ مہم کا آغاز کیا جس میں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ان کی مالی امداد کی تھی لیکن زید شہید ہو گئے۔ تاہم بنی ہاشم عام طور سے حصولِ خلافت کے لئے متحد و مجتمع ہوتے رہے۔ انہوں نے آلِ محمدؐ کے نام پر ایران و حجاز و عراق کے لوگوں کو اپنا ہمنوا کر لیا۔ اور آخر کار ابو مسلم خراسانی کی مدد سے بنی اُمیہ کے آخری حکمران مروان ثانی کو شکست دے کر ابو العباس سفاح عباسی نے خلافت بنی عباس کی بنیاد رکھ دی۔

پندرہویں، سولہویں اور سترہویں خلافتیں علی الترتیب ولید ثانی، یزید ثالث اور مروانِ ثانی پر ۱۲۵ھ سے لے کر ۱۳۲ھ تک تمام ہو گئیں، اور خلافت بنی اُمیہ دمشق اختتام کو پہنچی۔ اور عباسی دورِ خلافت شروع ہوا۔

خلفاء بنی عباس

ابو العباس سفاح

مسلمانوں کے اٹھارویں خلیفہ تھے۔ نام ابو العباس لقب سفاح خاندان بنی ہاشم سے عبد اللہ ابنِ عباس کے پوتے تھے۔ ۱۳۲ھ میں خلافت بنی اُمیہ کے خاتمہ کے بعد اٹھارویں خلیفۃ المسلمین قرار پائے، اور خلافت عباسیہ کے پہلے فرمانروا ہوئے۔ خلیفہ ہوتے ہی انہوں نے بنی اُمیہ سے اُن مظالم کا بدلہ خوب دل کھول کر لیا جو انہوں نے اپنے ادوارِ خلافت میں بنی ہاشم کے ساتھ کئے تھے۔ خاندانِ بنی اُمیہ کے بچے بچے کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر تہ تیغ کیا۔ صرف ایک شہزادہ عبد الرحمن نامی کسی نہ کسی طرح بچ کر اسپین (یورپ) پہنچ گیا جہاں اس نے حالات سازگار پاکر دوبارہ خلافتِ بنی اُمیہ قائم کر لی۔ لیکن یہ خلافت اسپین تک محدود رہی، مرکزی خلافت عباسیوں ہی کے پاس رہی۔ (خلافتِ اسپین کا ذکر علیحدہ ہوگا)

ابو العباس نے اپنی دھاک بٹھانے کے لئے ہزاروں مسلمانوں کو تہ تیغ کیا اور اپنے عمّال کے ذریعہ قتل وغارت گری کا بازار خوب گرم کرایا۔ اِن کے دَور میں کوئی نئی فتوحات تو نہیں ہوئیں البتہ اُنھیں مفتوحہ ممالک اور بلادِ اسلام پر اقتدار مستحکم کیا گیا جو اس سے پہلے بنی اُمیہ کے قبضے میں تھے۔ دار الحکومت دمشق کے بجائے پہلے ہاشمیہ اور پھر بغداد مقرر کیا گیا۔

عباسی خلیفہ سفاح نے چونکہ یہ اقتدار اہلِ بیتِ رسولؐ کے نام پر حاصل کیا تھا اس لئے حصولِ اقتدار میں تمام بنی ہاشم ان کے ساتھ تھے اور خاص طور سے ان کے چچا زاد بھائی عبداللہ بن علی نے اس جنگ اقتدار میں بڑے کارہائے نمایاں انجام دیئے تھے جن کی وجہ سے سفاح نے اپنے بعد اُن کو اپنا جانشین مقرر کردیا تھا۔ مگر سفاح کی موت کے بعد جب ان کا حقیقی بھائی منصور تختِ خلافت پر بیٹھا تو عبداللہ بن علی عباسی کے علاوہ سادات بنی فاطمہ کو بھی بہت مایوسی ہوئی کہ اُنھیں کے نام پر خلافت حاصل ہوئی اور اُنھیں کو نظر انداز کردیا گیا۔ چنانچہ منصور کے عہدِ خلافت میں بہت افراتفری نظر آتی ہے۔ ۱۳۶ھ میں سفاح تقریباً چار سال کارِ خلافت انجام دے کر انتقال کر گئے۔

ابوجعفر منصور

مسلمانوں کے انیسویں خلیفہ تھے۔ نام عبداللہ، باپ کا نام محمد، کنیت ابوجعفر، لقب منصور، ۱۳۶ھ میں اپنے بڑے بھائی سفاح کی موت کے بعد تختِ خلافت حاصل کیا۔ حصولِ اقتدار کے بعد اِن کو مندرجہ ذیل اہم مسائل کا سامنا تھا۔

(۱) عبداللہ بن علی کا دعویٰ خلافت (۲) ابو مسلم خراسانی کا بڑھتا ہوا اقتدار (۳) ساداتِ بنی فاطمہ کی متوازی خلافت (۴) خانوادۂ رسالت کے چھٹے ہادی امام جعفر صادق کی تبلیغِ رسالت کی مقبولیت (۵) دور دراز کے علاقوں کی بغاوتوں اور شورشوں کا سدباب کرنا۔

منصور نے انتہائی سیاسی چالاکیوں سے اِن مسائل کو اپنے حسبِ مرضی حل کیا۔ اُس نے پہلے ابو مسلم خراسانی کے ذریعہ عبداللہ بن علی کو جو اس کا چچازاد بھائی تھا شکست دی اور پھر اسے ایک مکان میں دبوا کر مروا دیا۔ اس کے بعد ابو مسلم خراسانی کو دھوکے سے اپنے قبضہ میں کر کے قتل کردیا۔ مدینہ میں اولادِ امام حسنؑ کے ممتاز افراد محمد نفس ذکیہ اور اُن کے بھائی ابراہیم فاطمی سادات کے قائد کی حیثیت سے اپنی خلافت کو لوگوں سے منوا رہے تھے۔ منصور نے پہلے تو اُن سے اپنی خلافت منوانی چاہی، لیکن جب اُسے اِس میں کامیابی نہ ہوئی تو پھر اُس نے اُن پر حملہ کردیا، اور پھر سادات پر اس قدر مظالم ہوئے اور ایسا قتل عام ہوا کہ لوگوں کو کربلا یاد آگئی۔ بغداد کے قصر و محلات میں سادات کے خون کا گارا دیا گیا۔ اُن کے بچوں کو زندہ دیواروں میں چنوایا گیا۔ اُن کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر قتل اور قید کیا گیا۔ بقولے

جب کوئی قصرِ ستم آرا بنا
خون سے سادات کے گارا بنا

بنی اُمیہ نے بھی وہ مظالم بنی ہاشم کے ساتھ نہ کئے تھے جو بنی عباس نے اہلِ بیتِ رسالت پر ڈھائے۔

تدوین فقہ جعفری

الغرض منصور جب اِن داخلی امور سے فارغ ہو کر مطمئن ہو گیا تو اس نے نظامِ حکومت کی طرف توجہ دی اور اُس کو مستحکم کیا۔ مقبوضہ علاقوں کی شورشوں کو دبایا، لیکن ایک کانٹا اب بھی ایک کھٹک رہا تھا جس سے اس کی حکومت کو خطرہ لاحق تھا، اور وہ تھا امام جعفر صادقؑ کی اعلانیہ تبلیغ اور تدریسِ علم۔ بنی عباس سے قبل تمام خلفاء کے زمانہ میں خانوادۂ رسالت کے ائمہ کو تبلیغِ اسلام کا علانیہ اور آزادی سے کبھی بھی موقع حاصل نہ ہو سکا تھا۔ (اس کا ذکر آئندہ خلافتِ الٰہیہ کے باب میں ہوگا۔) بنی اُمیہ اور بنی عباس کی خلافتوں کے درمیانی عرصہ میں جبکہ لوگ خلافتوں کے حصول کے چکر میں آپس ہی میں دست و گریبان تھے۔ امام جعفر صادقؑ نے مدینہ میں ایک بہت بڑی درسگاہ تدریسِ علومِ دین کے لئے قائم کر رکھی تھی جس میں تقریباً چار ہزار طلباء مختلف علوم و فنون کا درس آپ سے لے رہے تھے۔ آپ نے فقہ اسلامی کی تدوین کے ساتھ کتبِ احادیث بھی مرتب کرا دی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ مذہبِ اسلام کا وہ طریقہ جس کی تبلیغ رسول اللہ نے کی تھی اور جس کی پیروی تمام ائمہ اہلبیت کرتے رہے فقۂ جعفری یا مذہبِ امامیہ کہلاتا ہے، اس میں رسول اللہؐ سے لے کر امام حسن عسکریؑ تک کوئی اختلاف نہیں ہے۔

تدوین فقہ حنفی و مالکی

خلیفہ منصور اس بات کو اپنے لئے خطرہ سمجھتا تھا کہ اگر لوگ آخرت کا خیال کر کے اُس کی دنیوی حکومت کے خلاف ہو گئے تو حکومت سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔ لہٰذا اس نے فوراً ہی امام جعفر صادقؑ کے مقابلہ میں مدینہ میں امام مالک اور کوفہ میں امام ابو حنیفہ کو تعلیماتِ محمد و آلِ محمدؐ کے متوازی فقۂ اسلام تدوین کرنے پر آمادہ کرنا چاہا۔ مگر اِن دونوں حضرات نے تدوینِ فقہ سے معذوری کا اظہار اس بنیاد پر کر دیا کہ یہ دونوں اہلبیتِ رسولؐ کے معتقد تھے۔ اس پر منصور نے

امام مالک کو کوڑوں سے پٹوا کر کتاب موطا لکھنے پر مجبور کر دیا، اور امام ابوحنیفہ کے ساتھ بھی سختی کر کے ان کو تدوینِ فقہ پر مجبور کیا، اور اُن کی دلجوئی کے لئے اپنی مملکت میں یہ عام حکم دیا کہ جو کوئی امام ابوحنیفہ سے فتویٰ پوچھے گا اس کو ایک اشرفی انعام اور جو کوئی امام جعفرؑ سے فتویٰ پوچھے گا اس پر ایک اشرفی جرمانہ ہوگا۔ اس حکم کی وجہ سے فقۂ جعفری کی بہ نسبت فقۂ ابوحنیفہ و فقۂ امام مالک کو خاطر خواہ ترقی ہوئی۔ منصور نے دین میں اور زیادہ مداخلت کرتے ہوئے جب امام ابوحنیفہ سے احکامِ فقہ میں شریعت محمدی کے خلاف اپنی مرضی کے احکام تدوین کرانا چاہے تو انہوں نے تدوینِ فقہ سے قطعی انکار کر دیا، اس پر منصور نے ان کو قید کر دیا اور اسی حالتِ قید میں اُن کو زہر دے کر شہید کر دیا گیا اور مشہور کیا کہ وہ طبعی موت مرے ہیں۔ آپ کی شہادت کے بعد تدوین فقۂ حنفی کا جو کام ادھورا رہ گیا تھا وہ عباسی خلیفہ ہارون الرشید نے اپنے عہد خلافت میں امام ابوحنیفہ کے ایک شاگرد قاضی ابویوسف کے ذریعہ اپنی حسبِ مرضی اتمام کو پہنچایا۔

منصور کو امام جعفر صادقؑ کے خلاف جب کوئی بہانہ قتل نہ مل سکا جس سے وہ ان کے قتل کا جواز نکالتا تو اس نے خفیہ طریقہ سے آپ کو بھی زہر دلوا کر شہید کرا دیا۔

شہر بغداد کی تعمیر منصور کے عہد کا سب سے اہم کارنامہ شہر بغداد کی تعمیر ہے۔ دریائے دجلہ کے کنارے اپنے اور اپنے کارپردازانِ سلطنت کے لئے شاندار محلات کی تعمیر میں کروڑوں روپیہ صرف کر کے اس طرح بنایا گیا کہ وہ جنتِ ارضی معلوم ہونے لگا "تجری من تحتھا الانھار" کے مصداق محلوں کے نیچے نہریں جاری کرا کے آخرت کے بجائے دنیا میں ہی جنت کے مزے لوٹے، اور اپنے جانشینوں کے لئے بھی ایک مدت تک اس کا انتظام کر کے اپنی وعدہ گاہ کی طرف لوٹ گئے۔ مدتِ خلافت تقریباً ۲۲ سال رہی۔

محمد المہدی مسلمانوں کے بیسویں خلیفہ تھے۔ ۱۵۸ھ میں اپنے باپ منصور کے بعد تختِ خلافت پر بیٹھے۔ استحکامِ سلطنت باپ کے زمانہ میں ہی ہو چکا تھا۔ بیرونی فتوحات میں بازنطینیوں سے معرکہ آرائی کے بعد اُن سے خراج وصول کر کے

اپنے خزانہ میں اضافہ کیا۔ ان کے عہد میں مسلمانوں میں مختلف مکاتیب فکر وجود میں آئے۔ لیکن چونکہ یہ بھی اپنے باپ کی طرح راسخ العقیدہ سنّی تھے لہذا اپنے عقیدہ کے خلاف عقیدہ رکھنے والوں پر بہت سختیاں کیں اور انھیں قتل کرنے سے بھی گریز نہیں کیا۔ تقریباً دس سال حکومت کرکے راہی ملک عدم ہوئے۔

الہادی مسلمانوں کے اکیسویں خلیفہ تھے۔ مہدی کی وفات کے بعد ۱۶۹ھ میں ان کے بڑے صاحبزادے ابو موسیٰ ہادی نے زمام اختیار سنبھالی لیکن صرف ایک سال تک برسر اقتدار رہنے کے بعد حکومت اپنے بھائی ہارون الرشید کو سونپ دی۔ آپ بھی اپنے باپ دادا کی طرح سخت سنّی تھے ان کے زمانہ میں اہلبیت کے ایک فرد حسین ابنِ علی نے مدینہ میں دعوئ خلافت کیا۔ لیکن وہ ہادی کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ خلیفہ ہادی نے اپنے باپ مہدی کی وصیت کے خلاف بجائے اپنے بھائی ہارون کے خلیفہ بنانے کے اپنے بیٹے جعفر کو اپنا جانشین بنانا چاہا تھا اور اس سلسلہ میں اپنی ماں ملکہ خیزراں پر سختیاں کرنے کے علاوہ ہارون کے اتالیق یحییٰ برمکی کو قید بھی کر دیا تھا لیکن ہارون نے اس کوشش کو ناکام بنادیا اور شاید خفیہ طریقہ پر اپنے بھائی ہادی کو زہر دے کر مار دیا اور پھر تختِ خلافت پر قبضہ کر لیا۔

ہارون الرشید مسلمانوں کے بائیسویں خلیفہ تھے۔ ۱۷۰ھ میں اپنے بھائی ہادی کی موت کے بعد سریر آرائے تختِ خلافت ہوئے۔ ان کی سیاسی، علمی اور تمدنی سرگرمیوں کی وجہ سے ان کے دورِ خلافت کو عہدِ زریں کہا جاتا ہے۔ رفاہِ عام کے کام بھی ہوئے۔ انہوں نے بیت الحکمۃ کے نام سے ایک شعبہ قائم کیا جس میں مختلف علوم و فنون پر بہت سی کتابیں تصنیف و تالیف ہوئیں۔ مختلف زبانوں کی کتابوں کا ترجمہ بھی کیا گیا۔ قصوں کی ایک کتاب الف لیلیٰ نامی ان ہی کے زمانہ میں تحریر ہوئی جس میں یہ اور ان کے وزیر جعفر برمکی ہر کہانی کے اُس مرکزی نقطہ کی حیثیت سے نظر آتے ہیں جس کے گرد پورا دائرہ گھومتا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد اس کا پڑھنے والا اُس وقت کی تہذیب و تمدن کو اپنی نظروں کے سامنے دیکھتا ہے کہ حکمرانوں میں اور طبقۂ اُمراء میں رقص و سرود، چنگ و رباب، شراب و کباب، معیوب نہیں تھا، بلکہ یہ اُن کی صفات میں شمار ہوتا تھا۔ اِن کے عہد میں، علم نجوم و ہیئت، تاریخ و

منطق، شاعری و موسیقی کے علاوہ فقہ و حدیث کی تدوین بھی درجۂ کمال تک پہنچی - امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کے ذریعہ دو اور مکاتیبِ فقہی وجود میں آئے - صحاح ستہ، سنن ابی داؤد اور حدیث کی دیگر کتابیں ان کے عہد میں ہی پایۂ تکمیل کو پہنچیں -

مکاتیب فقہ اِن کے زمانہ میں پانچ مکاتیبِ فقہی رائج تھے - (۱) فقۂ جعفری (۲) فقہ مالکی (۳) فقہ حنفی (۴) فقہ شافعی (۵) فقہ حنبلی - اوّل الذکر فقہ کے ماننے والے شیعہ اور آخر الذکر چاروں فقہا کے پیروں کو اہلسنت والجماعت کہا جاتا ہے - یہ چاروں مکاتیبِ فکر اگرچہ کہ ایک دوسرے سے فروعی طور سے متضاد ہیں اور آپس میں ایک دوسرے پر تکفیر کا فتویٰ لگاتے ہیں لیکن اصولی طور سے فقۂ جعفری کے مقابلہ میں سب متحد ہو کر اس فقہ کے ماننے والوں کو کافر قرار دیتے ہیں اور انہیں واجب القتل خیال کرتے ہیں - اس کے برعکس جعفری شیعہ اِن سب کو کلمہ گو ہونے کی وجہ سے مسلمان سمجھتے ہیں - سوائے اُن لوگوں کے جو ختمی مرتبت رسول کریم کے بعد کسی دوسرے نبی کے قائل ہوں یا احکام شرع، نماز، روزہ، حج و زکوٰۃ وغیرہ کی علانیہ تکذیب کرنے ہوائے ہوں -

اِن کے دورِ اقتدار میں سادات کشی کے ساتھ ساتھ اور دوسری بغاوتوں کو بھی فرو کیا گیا - خانوادۂ رسالت کے ساتویں ہادی امام موسیٰ کاظم کو پہلے قید رکھا گیا پھر زہر دے کر شہید کیا گیا اور اُن کی نعش دریائے دجلہ کے پل پر رکھوا کر اعلان کرایا کہ یہ شیعوں کے امام کی میت ہے - جب اس کی خبر ہارون کے چچا کو ہوئی جو مذہب شیعہ رکھتے تھے تو انہوں نے نہایت اکرام و اعزاز کے ساتھ میتِ امام کو دفن کرایا -

برامکہ کا زوال اِن کے عہد میں پورے طور سے داخلی استحکام رہا - بیرونی فتوحات میں رومیوں پر فتح حاصل کی، لیکن خاندانِ برامکہ کو جو عباسی حکومت کا زبردست پشت پناہ تھا تباہ و برباد کر کے ایک بڑی سیاسی غلطی کی جس کا خمیازہ اِن کے جانشینوں کو اٹھانا پڑا اور آخر کار عباسی حکومت کے زوال کا پیش خیمہ بنا - تقریباً تئیس ۲۳ سال حکومت کرنے کے بعد اس سرائے فانی سے عالمِ جاودانی کی طرف عازم سفر ہوئے - سفر سے پہلے انہوں نے اپنے تین بیٹوں امین و مامون و موتمن کو یکے بعد دیگرے خلافت

کا حقدار قرار دیا۔ اس فیصلے نے بعد کو خطرناک صورت اختیار کرلی جو امین کے قتل پر منتج ہوئی۔

امین الرشید مسلمانوں کے تیئیسویں خلیفہ تھے۔ ۱۹۳ھ میں اپنے باپ کی وفات کے بعد خلیفۃ المسلمین بنے۔ باپ کی وصیت کے خلاف اپنے وزیر فضل بن ربیع کے مشورہ سے اُس خزانہ پر قبضہ کرلیا جو مامون کو ملنا چاہیئے تھا۔ دوسرا کام یہ کیا کہ وصیت کے خلاف بجائے مامون کو ولی عہد بنانے کے اپنے کمسن بیٹے موسیٰ کو اپنا جانشین مقرر کر کے مامون کو محروم خلافت کردینا چاہا۔ اس پر مامون نے بغاوت کردی اور ایرانیوں کی مدد سے ایک سخت جنگ کے بعد امین کو قتل کر کے خود خلیفہ ہونے کا اعلان کردیا۔ اس خانہ جنگی میں ہزاروں مسلمان مارے گئے۔ عربوں اور ایرانیوں کے درمیان مذہبی و علاقائی عصبیت کھیل گی۔ امین کی مدت خلافت تقریباً ۵ سال رہی جو خانہ جنگی میں بسر ہوئی۔

مامون الرشید مسلمانوں کے چوبیسویں خلیفہ تھے۔ ۱۹۸ھ میں امین کے بعد تختِ خلافت پر جلوہ گر ہوئے۔ یہ چونکہ ایرانیوں کی مدد سے اقتدار پر پہنچے تھے، لہذا قدرتی طور سے نظام حکومت میں ایرانیوں کا عمل دخل ہوتا گیا جو عربوں کو نہایت ناگوار ہوا اور یہ ناراضگی اس وقت اور بھی شدت اختیار کرگئی جب مامون نے ایرانیوں کو (جو زیادہ تر شیعی عقائد کے تھے) خوش کرنے کے لئے خانوادۂ رسالت کے آٹھویں ہادی امام علی الرضاؑ کو اپنا ولی عہد بنا کر خلافت کو اہلبیت میں منتقل کرنے کا اعلان کیا۔ اگرچہ یہ مامون کی ایک سیاسی چال تھی، مگر عرب مسلمان جو منصور و ہارون کے عہد میں اُن کے خرید کردہ علماء کے ذریعہ شیعوں کے خلاف انتہائی تعصب میں مبتلا ہوگئے تھے یہ کسی طرح برداشت نہیں کرسکتے تھے کہ حکومت خانوادہ رسالت میں منتقل ہو۔ ان مولویوں نے شیعوں کو کافر ثابت کرنے کے لئے ان جاہل مسلمانوں کو یہ بتا کر گمراہ کر رکھا تھا کہ شیعہ حضرت علیؑ کو خدا سمجھتے ہیں۔ ذبیحہ کے وقت بجائے تکبیر کے نعرۂ یا علی کہہ کر جانور ذبح کرتے ہیں۔ صحابہ کو بُرا کہتے ہیں۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کے منکر ہیں۔ ان کے امام ساحر ہیں۔ یہ دھوکے باز ہیں۔ کھانے اور پانی میں تھوک کر اور اُسے سنیوں کو کھلا کر اُن کا ایمان خراب کرتے ہیں۔ غرض کہ اسی طرح کی اور بہت سی جھوٹی اور لغو باتوں سے مسلمانوں کو

محمدؐ اور آلِ محمدؐ سے برگشتہ کر رکھا تھا۔ شیعوں سے میل جول۔ اُن سے اکل شرب اد۔ اُن د کتابوں کو پڑھنے سے منع کر رکھا تھا۔ چنانچہ ان حالات کی موجودگی میں وہ شیعوں کا اقتدار میں آجانا کیسے برداشت کر لیتے چنانچہ انہوں نے بنی عباس کے ایک فرد ابراہیم بن مہدی کو اپ خلیفہ بنا کر مامون کے خلاف بغاوت کر دی۔ مامون نے اس صورتِ حال کو اس طرح تدبیر کیا کہ امام علی الرضا کو انگوروں میں زہر دے کر شہید کر دیا لیکن ظاہرا طور سے امام کا غم منا کر اور جنازہ میں شرکت کر کے ایرانیوں کو بھی اپنے سے بدظن نہ ہونے دیا۔ دوسرا کام یہ کیا کہ ایران کے شہر مرو سے اپنا دارالخلافہ دوبارہ بغداد منتقل کر لیا۔ اور اس حکمت عملی سے اُس نے عربوں اور ایرانیوں دونوں کو خوش کر کے تمام داخلی بغاوتوں کو ختم کر دیا۔ مامون کے عہد میں بھی سابقہ عباسی خلفاء کے عہد کی طرح ساداتِ بنی فاطمہ کا خون بے دریغ بہایا گیا۔

ان کے عہد حکومت میں اندرونی بغاوتوں اور شورشوں کے فرد ہونے کے ساتھ کچھ فتوحات بھی ہوئیں۔ اپنے باپ کی طرح یہ بھی اپنے علمی کارناموں کے لئے مشہور ہیں۔ باپ کے علمی خزانہ میں بہا اضافہ کیا اور ایک رصدگاہ بھی تعمیر کرائی۔

عقائد کے لحاظ سے مامون پہلے سنّی پھر شیعہ اور آخر میں معتزلی ہو گئے تھے اور اس آخری عقیدہ پر اتنی سختی سے قائم تھے کہ اپنے عقیدہ کے خلاف عقیدہ رکھنے والوں کو سختیوں کے ساتھ قتل تک کرانے کا حکم دے رکھا تھا۔ ان کے عہد میں بھی مسلمانوں میں بہت سے فرقے وجود میں آئے۔ بابک خرمّی نے اشتراکی تحریک چلائی جو ناکام ہو گئی۔ ہارون کی طرح مامون کا عہد بھی سوائے مذہبی فرق کے اپنی علمی و تمدنی سرگرمیوں کی وجہ سے شاندار کہا جا سکتا ہے۔

مدتِ خلافت تقریباً بیس سال رہی۔

معتصم باللہ

مسلمانوں کے پچیسویں خلیفہ تھے۔ مامون کے بعد ان کے بھائی معتصم کے لقب سے ۲۱۸ھ میں تخت نشین ہوئے۔ عقائد کے لحاظ سے اپنے بھائی کی طرح یہ بھی معتزلی تھے۔ اگرچہ زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے لیکن انتظام حکومت میں ماہر تھے۔ انہوں نے استحکام حکومت کے لئے عربوں اور ایرانیوں کے بجائے ایک نئے عنصر ترکوں سے کام لیا۔ اور ان کو اقتدار کے لئے استعمال کر کے حکومت کے توازن کو برقرار رکھا۔ ان کے زمانہ میں جو

بغاوتیں ہوئیں وہ انھیں ترکوں کی مدد سے فرو کی گئیں۔ بابک خرمی اور رومیوں کا قلع قمع کیا گیا۔ مامون کے بیٹے عباس نے سازش کر کے خود خلیفہ بننا چاہا تو اُسے گرفتار کر کے قید کر دیا اور اس کے تمام حامیوں کو قتل کرا دیا۔ ان کے زمانہ میں لاکھوں انسانی جانوں کا خون بہایا گیا۔ اپنے بھائی مامون کی طرح انہوں نے بھی اپنے مذہبی عقیدہ کے خلاف عقیدہ رکھنے والوں پر سختیاں کیں اور قتل بھی کرایا۔ امام احمد بن حنبل پر ان کے حکم سے ہی کوڑے برسائے گئے۔ یہ ایسے ہم آپ مسلمانوں کے خلیفہ، امام اور اولی الامر شمار ہوتے تھے۔ خطبہ جمعہ میں ان کو امیر المومنین کہا جاتا تھا۔ سب مسلمان ان کی اقتدا میں نماز ادا کرتے تھے۔ یہاں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اہلسنت جن کے یہاں تقیہ حرام ہے وہ کس طرح ایک بدعقیدہ، بدعتی، معتزلی کی اقتدا میں نماز پڑھتے تھے۔ اس کو اپنا امام بناتے تھے۔ اُس کے نام کا خطبہ پڑھتے اور سنتے تھے اور اس کی تعریف کرتے تھے۔ اگر یہ افعال وہ ظاہر کرتے تھے اور دل سے نہیں مانتے تھے تو یہ تقیہ ہوا جو ان کے نزدیک فعلِ حرام ہے اور اگر دل سے کرتے تھے تو پھر وہ سب معتزلی ہو گئے تھے اہلسنت نہ رہے۔ اور اگر وہ اہلسنت رہ کر امام نہیں مانتے تھے تو پھر انہوں نے ایسی بغاوت کیوں نہیں کی جیسی بغاوت معاویہ اور طلحہ و زبیر وغیرہ نے حضرت علیؑ اور امام حسنؑ کے خلاف کر کے اُن کی خلافتوں کو ناکام بنا دیا تھا۔ اس قسم کے بہت سے سوال پیدا ہو جاتے ہیں جن پر غور کرنے پر ایک دانشور مجبور ہو جاتا ہے۔ بہر حال خلیفہ معتصم تقریباً ۹ سال حکمرانی کر کے راہئ عدم ہوئے۔

واثق باللہ مسلمانوں کے چھبیسویں خلیفہ تھے۔ ۲۲۷ھ میں اپنے باپ کے بعد تخت نشین ہوئے۔ یہ بھی اگرچہ عقیدتاً معتزلی تھے لیکن زیادہ سخت نہ تھے ان کے عہد میں فلسطین و دمشق میں بغاوتیں ہوئیں جو فرو کر دی گئیں۔ ۵ سال تک اطمینان سے حکومت کر کے اپنے بھائی متوکل کے لئے تختِ خلافت خالی کر گئے۔

المتوکل علی اللہ مسلمانوں کے ستائیسویں خلیفہ تھے۔ ۲۳۲ھ میں اپنے بھائی کے مرنے پر خلیفۃ المسلمین ہوئے۔ اپنے باپ اور بھائی کے برعکس عقیدتاً اہلسنت تھے اور بہت سخت مذہبی تعصب میں مبتلا تھے۔ خلیفہ ہوتے ہی انہوں نے اُن تمام معتزلی امراء کو برطرف کر دیا جنہوں نے ان کو خلیفہ بنایا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ اُن کے مشیر قاضی احمد بن داؤد بھی ان کے

عتاب کا شکار ہو گئے کیونکہ وہ بھی معتزلی عقیدہ کے حامل تھے۔

انہدام قبر حسینؑ

اس نے اپنے خلاف عقیدہ رکھنے والے معتزلہ اور شیعوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا تھا۔ اہلبیتِ رسالت سے دشمنی کا یہ عالم تھا کہ اس نے قبر حسینؑ کو مسمار کرا دیا۔ زائرینِ قبر حسینؑ کے ہاتھ کٹوائے اور انہیں قتل تک کرایا۔ اُنھیں خوفزدہ کیا کہ وہ زیارت قبر حسینؑ کے لئے نہ آئیں۔ لیکن عاشقانِ اہلبیت ان سختیوں کے باوجود زیارت سے باز نہ آئے۔ متوکل کے ان کارناموں سے بنی اُمیہ کے جابر خلفاء کی روح بھی شرما گئی ہوگی۔

عقاید کی اشاعت

اس نے قرآن کی آیات پر غور و فکر کرنے پر سخت پابندی عائد کی۔ اور ان حدیثوں کی نشر و اشاعت پر بہت زور دیا جو خلفائے ماسبق کے خرید کردہ علماء نے اُن کی خوشنودی کے لئے، رسول اللہ سے منسوب کر کے وضع کی تھیں اور جو منشائے الٰہی کے خلاف اور آیاتِ قرآن سے متصادم تھیں۔ محمدؐ و آلِ محمدؐ کی پیش کردہ توحید الٰہی کے خلاف اِس نے رویت الٰہی کا یہودی اور مسیحی نظریہ یعنی خُدا کا مجسّم ماننا پیش کیا۔ اور اس شرک فی التوحید کے عقیدہ کو زبردستی منوانے کا حکم دیا۔ اس نے فرمان جاری کیا کہ اسلام اور اس کے عقائد کی وہی تشریح صحیح ہے جو خلفاء کے زمانہ سے احادیث میں کی گئی ہے۔ چاہے وہ قرآن کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ (تاریخ اسلام از سیّد عین الحق)
اگر اس کے عقیدہ کے مطابق خدا کے مجسم ہونے، اس کے تختِ عرش پر متمکن ہونے اور قیامت میں اس کے دیدار کو مان لیا جائے تو پھر مندرجہ ذیل نتائج برآمد ہوں گے۔

۱۔ اگر وہ مجسّم ہے تو اس کے جسم کو بنانے والا کوئی اور ہوگا کیونکہ کوئی جسم خود بخود نہیں بن سکتا۔

۲۔ اگر وہ مجسّم ہے تو پھر بیٹھنے کے لئے تخت کا، چلنے کے لئے پیروں کا اور کام کرنے کے لئے ہاتھوں کا، دیکھنے کے لئے آنکھوں کا، سننے کے لئے کانوں کا، غرض کہ ہر کام کے لئے ہر چیز کا محتاج ہوگا تو پھر اس کی صمدیت ختم ہو جائے گی۔

۳۔ اگر وہ مجسّم ہے تو محدود ہو کر اپنی لامکانیت سے محروم ہو جائے گا۔ اور ساتھ ہی حادث ہو کر

قدیم نہ رہے گا۔

۴۔ اگر اُسے مجسّم مان لیا جائے تو پھر وہ شئے ہو جائے گا اور اس طرح قرآنِ مجید میں اللہ کا یہ فرمانا کہ "لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ" یعنی کوئی شئے اس کی مثل نہیں ہے۔ غلط ہو جائے گا۔

۵۔ اگر اُسے مجسّم مان لیا تو پھر اس کے اعضائے جسم اس کے افعال کے شریک ہو جائیں گے اور اس طرح شرک فی التوحید لازمی ہو جائے گی۔ اسی طرح اور بہت سی خرابیاں پیدا ہو جائیں گی۔ بہ خوفِ طوالت صرف ان پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے۔ توحید باری تعالےٰ میں شرک کا یہ بنیادی عقیدہ ہی سینکڑوں خرابیوں کا سبب بنا ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم کے خلاف ہے اور یہی وجہ ہے کہ مذہب جعفری اور دیگر تمام فرقہ ہائے اسلامی کے درمیان اصولی اور فروعی اختلافات ہیں۔

بہر حال متوکل کے ان بہیمانہ مظالم اور اپنے عقائد کو دوسروں سے جبریہ طور پر سے منوانے کی وجہ سے اہلسنت کے مورخین وعلماء نے اس کو محی سنت (سنت کو زندہ کرنے والا) کا خطاب دیا ہے۔ قابلِ غور یہ بات ہے کہ جبریہ طور سے اپنے عقائد کو منوانا نہ تو سنتِ الٰہی ہے اور نہ سنتِ رسولؐ، البتہ سنت خلفاء ضرور ہے کہ دو چار کو مستثنیٰ کر کے تمام خلفاء کے دور میں اپنے عقائد کو زبردستی منوانے کے تاریخی ثبوت موجود ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ مسلمان ان خلفاء کی سنت پر عمل کرتے ہوئے اپنے عقائد کو دوسروں سے زبردستی منوانے کی کوششوں سے باز نہیں آتے جبکہ خود اُن کے پاس اپنے عقائد کو صحیح ثابت کرنے کے لئے کوئی دلیل نہیں ہوتی سوائے اس کے کہ وہ مذہبی تعصب میں مبتلا ہو کر کسی قوم سے بلاوجہ دشمنی کرتے ہیں اور اس طرح وہ راہِ عدل سے ہٹ کر حکمِ خُدا کی کھلے طور سے مخالفت کرتے ہیں۔ سورۂ مائدہ کی آیت ۸ ٥ یا ایھا الذین اٰمنوا ...... بما تعلمون ٥

ترجمہ:۔ اے ایمان والو خدا کی خوشنودی کے لئے انصاف کے ساتھ گواہی دینے کے لئے تیار رہو، اور تمہیں کسی قوم کی عداوت اس جرم میں نہ پھنسوا دے کہ تم ناانصافی کرنے لگو (خبردار) تم (ہر حال میں) انصاف کرو کہ یہ تقویٰ سے قریب ہے۔ اور خدا سے ڈرو کہ جو کچھ تم کرتے ہو وہ اُسے جانتا ہے۔

تشریح :- تقویٰ سے قریب ہونے کے لئے عدل کرنا لازمی ہے محض عقیدے کی بناء پر کسی پر ظلم کرنا عدل کے خلاف ہے۔

اسلام دینِ عقل ہے۔ خالقِ کائنات اپنی کتاب میں خود اپنی ہی آیت کو اندھے بہروں کی طرح قبول کرنے کو پسند نہیں کرتا۔ سورۂ فرقان کی آیت ۷۳ ہ والذین .... صماً و عمیاناً ہ

ترجمہ :- اور وہ لوگ جب انہیں ان کے پروردگار کی آیت یاد دلائی جاتی ہیں تو وہ بہرے اور اندھے ہو کر (اُن پر) نہیں گر پڑتے "

اس بات کی دلیل ہے کہ آیت قرآن کو عقل کی کسوٹی پر پرکھ کر قبول کرنا ہی اصل ایمان ہے۔ اگر کوئی مُسلمان بغیر سمجھے ہوئے سب سے اہم عبادت نماز بھی پڑھے اور بڑی پابندی اور اہتمام سے اُسے ادا کرے تو بھی اللہ اس کو نیکی قرار نہیں دے دیتا۔ وہ سورۂ بقر کی آیت ۱۷۷ میں ارشاد کرتا ہے۔ ہ لیس البّر .... ھُم المتقون ہ

ترجمہ :- یہ کوئی نیکی نہیں ہے کہ تم مشرق یا مغرب کی طرف اپنے منہ پھیر لو[1]، لیکن نیکی یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ پر، روز قیامت پر، فرشتوں پر، خدا کی کتابوں پر اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لائے اور جو اپنا مال اللہ کی محبت میں اپنے قرابت داروں، یتیم و مسکین و مسافروں اور سائلوں کو دے اور قیدی چھڑانے کے لئے خرچ کرے۔ اور نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے اور اگر کوئی عہد کرے تو اس کو پورا کرے اور بھوک پیاس و رنج و مصیبت میں دقت قتل صبر کرے تو یہ وہ لوگ ہیں جو سچے ہیں اور یہ سب متقی ہیں۔

اللہ نے ایک اور جگہ سورۂ ماعون کی آیت ۴ و ۵ میں ارشاد فرمایا۔ فویل للمصلین .... عن صلاتھم ساھون ہ

ترجمہ :- مقام تاسّف ہے ان نمازگزاروں کے لئے جو اپنی نماز کو ضائع کرتے ہیں اور

---

[1] واضح ہو کہ کعبہ کے چاروں اطراف بسنے والوں پر کعبہ کی سمت اپنا منہ کر کے نماز ادا کرنے کا حکم ہے مشرق و مغرب سے مُراد چاروں سمتیں ہیں۔

نمازی نہیں اگر کوئی ایسی مسجد بھی بنائے جس کی بنیاد تقویٰ پر نہ ہو تو اسے بھی وہ جائے عبادت کے طور پر قبول کرنے کو تیار نہیں بلکہ اُسے **مسجد ضرار** کی طرح منہدم کردیے جانے کے قابل سمجھتا ہے۔

اللہ اپنی کتاب میں اپنے احکام کے ہر امر و نہی کو سمجھانے اور انسان کو ان کے فوائد بتانے کے لئے اپنے معلموں کو ذریعہ (واسطہ) بناتا ہے اور ان معلمین کی کی ہوئی تشریحِ آیتِ قرآن پر ایمان لائے بغیر کسی شخص کے اعمال کو قبول کرنے کے لئے بالکل تیار نہیں ہے اور یہ ایمان بھی وہ جبر و اکراہ کے بغیر قبول کرنے کو کہتا ہے زبردستی نہیں۔ اس نے انسانی خمیر میں فجور و تقویٰ ودیعت کرکے اُسے منزلِ ابتلا میں رکھ کر راستہ کی ہدایت بھی کردی اور انسان کو اختیار بھی دیا کہ چاہے وہ شکر کرے یا کفر کرے، دونوں کی جزا و سزا بھی مقرر کردی اور اس طرح اُس نے مسلمانوں کے جبریہ و قدریہ فرقے کے نظریات کی بھی نفی کردی جو اُن کے عقیدۂ توحید میں شامل ہے۔

متوکل کا قتل

متوکل کی اس شدید مذہبی عقیدت کی بناء پر ترک اور ایرانی دونوں بیزار تھے۔ سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ اس نے اپنے بڑے بیٹے منتصر کو اُس کے معتزلہ عقائد رکھنے کی وجہ سے ولی عہدی سے معزول کرکے اپنے دوسرے بیٹے معتز کو اپنا جانشین مقرر کرنے کا اعلان کیا۔ اس پر منتصر نے ترکوں کے ذریعہ اپنے باپ کو قتل کراکے اپنی خلافت کا اعلان کردیا۔ متوکل کی مدتِ خلافت تقریباً ۱۴ سال رہی۔

المنتصر

مسلمانوں کے اٹھائیسویں خلیفہ تھے۔ ۲۴۶ھ میں باپ کو قتل کراکے سریر آرائے تختِ خلافت ہوئے۔ اپنے والد کے برعکس معتزلی عقیدہ کے حامل تھے۔ انہوں نے اپنے والد کی تمام زیادتیوں کی تلافی کرکے مظلوموں کی دادرسی کی۔ مزار امام حسینؑ کی دوبارہ تعمیر کرائی، زائرینِ قبرِ حسینؑ کے لئے حتی المقدور سہولتیں فراہم کیں۔ معتزلہ اور شیعہ عقائد رکھنے والوں کو قیدِ غم سے رہائی دی لیکن ان کی مدتِ حیات کی طرح مدتِ خلافت بھی زیادہ نہ ہوئی، صرف ایک سال بعد ہی ان کا انتقال ہوگیا۔ ان کے بعد انتیسویں خلیفہ کی حیثیت سے ۲۴۷ھ میں ان کے چچازاد بھائی مستعین نے تختِ خلافت

کو رونق بخشی۔ ۲۵۲ھ میں پھر متوکل کے دوسرے بیٹے معتز نے اقتدار سنبھالا۔ ۲۵۵ھ میں پھر متوکل کے بھتیجے مہدی نے تختِ حکومت پر قبضہ کیا۔ اور اس طرح یہ سلسلہ ۶۵۶ھ تک چلتا رہا۔ بنی عباس کے انتالیسویں اور مسلمانوں کے چھپنویں خلیفہ معتصم عباسی کی ہلاکو خان کے ہاتھوں ہلاکت اور بغداد کی تباہی پر بغداد کی عباسی خلافت کا خاتمہ ہو گیا۔

زوالِ بغداد ہلاکو خان کی تاتاری فوج نے انتہائی بربریت کا مظاہرہ کرتے ہوئے تقریباً سولہ لاکھ انسانوں کو قتل کیا۔ شہر کو تاراج کیا۔ اور سب سے بڑھ کر اس علمی خزانہ کو دریا برد کر دیا جو عباسی عہد کا زریں کارنامہ تھا۔ بغداد کی تباہی کے بعد مسلمانوں کی رہی سہی مرکزی حیثیت جو متوکل کے زمانہ سے انحطاط پذیر تھی برائے نام رہ گئی۔ ہر خطہ و مقام پر خود مختار سلطنتیں وجود میں آ گئیں جن میں کچھ تو خلافت سے منسلک رہیں اور کچھ خلافت سے نبرد آزما رہیں۔

تجزیہ ان مسلم خلفاء اور سلاطین و شہنشاہوں میں ہر قسم کے لوگ ہوئے۔ اچھے بھی بُرے بھی۔ عالم بھی، جاہل بھی۔ عابد بھی، فاسق بھی۔ بہادر بھی، بزدل بھی۔ مظلوم بھی، ظالم بھی۔ مقتول بھی، قاتل بھی۔ محنتی بھی، عیش پسند بھی۔ بردبار بھی، مغلوب الغضب بھی۔ فاتح بھی، مفتوح بھی۔ سُنّی بھی، شیعہ بھی۔ ناصبی بھی معتزلی بھی، غرض کہ ہمہ اقسام کے ہونے کے باوجود یہ سب سوادِ اعظم کے مذہبی پیشوا اور قابلِ احترام شمار ہوتے تھے۔ خلیفۃ المسلمین، امیر المومنین اور اولی الامر سمجھے جاتے تھے۔ اپنے اپنے ادوارِ خلافت و بادشاہت میں ان کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا۔ بہت سے بادشاہوں کو ظلِ سبحانی عالم پناہ اور ان جیسے بہت سے خطابوں سے مخاطب کر کے ان کی تعظیم و تکریم کی جاتی تھی۔ اُن کے ہر خلافِ شرع کام کو نہ صرف سراہا جاتا ہے بلکہ اسے کھینچ تان کر عین اسلام بنایا جاتا ہے۔

ان تمام خلفاء و سلاطین میں باوجود متضاد طبائع انسانی اور باوجود مختلف العقائد ہونے کے ایک بات مشترک ہے اور وہ یہ کہ باستثناء چند سب نے ہی حاکمیتِ الٰہی کے بجائے انسانی اقتدار قائم کیا۔ یہ اسلام کا نام لے کر لاکھوں انسانی جانوں کی ہلاکت کا باعث ہوئے۔ کبھی انہوں نے آپس میں قتل و خون کا بازار گرم کیا کبھی غیروں سے لڑے۔ انہوں نے

انسانوں میں طبقاتی فرق پیدا کیا۔ آقا و غلام، حاکم و محکوم، اعلیٰ و ادنیٰ، راعی و رعایا، غرض کہ یہ سب
تماشے تاریخ میں نظر آتے ہیں۔ انہوں نے نسلی و علاقائی تعصب پیدا کیا۔ اپنے قریشی و ہاشمی واموی و
عباسی و فاطمی ہونے پر فخر کیا۔ عرب کو عجم سے بلند مرتبہ دے کر عجمیوں کو ذلیل کیا۔ افریقیوں اور ترکوں
کو اپنا غلام بنایا حالانکہ وہ مسلمان ہی ہوتے تھے۔ انہوں نے لسانی تعصب پیدا کر کے عربی زبان کو
تمام زبانوں پر فوقیت دی۔ انہوں نے مذہبی تعصب پیدا کیا۔ ہر مکتبِ فکر کے افراد نے دوسرے
مکاتیبِ فکر کے افراد کو جہنمی سمجھ کر اُن پر طرح طرح کے مظالم کئے۔ اور اس مذہبی تعصب کی بدولت
مسلمانوں میں افتراق و انتشار پیدا کر کے اُن کی وحدتِ ملّی کو پارہ پارہ کر دیا۔ انہوں نے عوام الناس
کو تعلیم سے قصداً بے بہرہ رکھا تا کہ وہ اصل حقیقت تک نہ پہنچ سکیں۔ اور ان کے اقتدار کے لئے
خطرہ نہ بن سکیں۔ انہوں نے مذہب کے معنی نماز روزہ حج زکوٰۃ کی ادائیگی تک محدود کر دیئے
اور وہ بھی اپنے پروردہ علماء کے بتائے ہوئے طریقہ سے۔ انہوں نے علم دین کو احادیث
میں محصور کر دیا۔ قرآن کو ناظرہ پڑھنے یا اگر بہت زیادہ زور دیا تو حفظِ قرآن کو بہت بڑا دینی کام
سمجھا۔ اس کو سمجھنے یا اس سے ہدایت لینے پر سخت پابندیاں عائد کیں۔ انہوں نے دیگر علوم
تک عوام الناس کی دسترس کو ممنوع قرار دیا، علمِ سائنس کے حصول کو خلافِ مذہب قرار دے کر
عوام الناس کو اس سے برگشتہ کیا۔ ان خلفاء میں سے اگر کسی کے عہد میں کوئی سائنسی تحقیق ہوئی
بھی تو وہ یا تو حکمران طبقے کے لئے مخصوص تھی یا پھر ایک خاص طبقہ اُس سے مستفید ہو سکا۔

خلافت وملوکیت

عباسیہ خلافت متوکل کے بعد سے ایک کٹھ پتلی بن گئی تھی عرصہ
تک ترکوں کے ہاتھ خلفاء کا عزل و نصب رہا۔ پھر سامانیوں
نے اس پر قبضہ جمایا۔ ان کے بعد آلِ بویہہ خلافت پر چھائے رہے۔ آلِ بویہہ سے اقتدار
سلجوقیوں کے پاس آیا۔ اس خاندان کے ایک بادشاہ ملک شاہ سلجوقی کے وزیر نظام الملک
طوسی نے باقاعدہ اور آئینی طور سے خلافت و حکومت کو دین و دنیا کے دو علیحدہ علیحدہ شعبوں
میں تقسیم کر دیا۔ سیاست نامہ نامی کتاب اس کی خاص تصنیف ہے۔ اس سے کچھ عرصہ
پہلے عیسائی بھی کلیسا اور حکومت کو دو علیحدہ علیحدہ شعبوں میں تقسیم کر چکے تھے۔ اس وقت سے
آج تک عیسائیوں اور مسلمانوں میں یہی نظریہ قائم ہے۔ تمام مشاہیرِ عالم، مذہب اور حکومت

کو علیحدہ علیحدہ چیزیں خیال کرتے ہیں۔ درآنحالیکہ اسلام اس نظریہ کی نفی کرتا ہے کیونکہ وہ ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جو تمام انسانوں کے لئے اُن کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر شعبہ کی رہنمائی کرتا ہے۔

جس طرح عیسائیوں میں پوپ کو مذہبی رہنما خیال کیا جاتا ہے۔ اسی طرح مسلمانوں میں خلیفہ کو مذہبی رہنمائی تک محدود کر دیا گیا تھا۔ کاروبارِ حکومت چلانے کا کام مختلف ممالک میں اور دوسرے لوگ جن کو بادشاہ، شہنشاہ، سلطان، سردار وغیرہ کہا جاتا ہے، کرنے لگے۔ ان میں جو سنی العقیدہ تھے وہ خلافت سے منسلک رہے، جو شیعہ عقائد کے تھے وہ ائمہ اہلبیت کی امامت کے قائل رہ کر اپنی حکومت کرتے رہے۔

خلفاء عباسیہ (مصر)

۶۵۶ھ میں زوالِ بغداد کے بعد جب عباسیہ خلافت ختم ہو گئی۔ تو اس خاندان کا ایک شہزادہ ابوالقاسم بن ظاہر باللہ جو ہلاکو کے دستِ ظلم سے نہ معلوم کس طرح بچ گیا تھا، مصر پہنچ گیا۔ یہاں کے بادشاہ ملک ظاہر بیبرس نے اپنی سیاسی ضرورت کے پیشِ نظر اُس کو اپنے تنخواہ دار ملازم کی حیثیت سے مسلمانوں کا دینی رہنما یعنی خلیفہ بنا دیا۔ اور اس طرح ۶۵۹ھ میں تین سال تک مسلمان بے امام و خلیفہ رہنے کے بعد پھر با امام ہو گئے۔ لیکن اس خلافت و امامت سے ۹۲۵ھ تک محروم رہے جس میں خلیفہ کا امامت کے ساتھ حاکم ہونا بھی ضروری ہوتا ہے۔

ڈھائی سو سال سے زیادہ عرصہ تک ابوالقاسم مذکور کی اولاد یعنی خاندانِ عباسیہ کے تقریباً پندرہ تنخواہ دار خلیفہ مصر میں مسلمانوں کی دینی رہنمائی کے منصب پر فائز رہے۔

خلفاء عثمانیہ (ترکی)

۹۲۵ھ میں ترکانِ آلِ عثمان میں سے ایک سلطان جو سلطنتِ عثمانیہ کے بانی غازی عثمان خان کے نویں جانشین تھے، اور جن کا لقب سلیم اول تھا انہوں نے مصر کو فتح کرنے کے بعد مصر میں عباسی خلیفہ متوکل سوم کو (جو ترتیب کے لحاظ سے مسلمانوں کے اکہترویں خلیفہ تھے) اپنے قبضہ میں کیا اور

اپنے ساتھ اپنے دار الحکومت قسطنطنیہ لے گئے۔ وہاں انہوں نے جامع آیا صوفیہ میں اُن سے خرقۂ خلافت یعنی رسول اللہ کی چادر، علم اور تلوار لے کر مسلمانوں کے بہتر ویں باقاعدہ خلیفہ ہونے کا اعلان کردیا۔ اور اس طرح مسلمانوں کو متوکل عباسی اوّل آف بغداد کے عہد یعنی ۲۴۶ھ کے بعد سے ۹۲۵ھ میں تقریباً سات سو سال بعد خود مختار خلیفہ وامام ملا جو بغیر کسی دباؤ کے حکمرانی کے ساتھ دینی فرائض بھی ادا کر رہا تھا۔ سلیم اوّل کا انتقال ۹۲۶ھ میں ہوگیا۔ ۹۲۶ھ میں سلیم اوّل کے بعد سلیمانِ اعظم مسلمانوں کے تہتر ویں خلیفہ کی حیثیت سے تختِ خلافت پر متمکن ہوئے۔ اِن کا دور مسلمانوں کی پوری تاریخ میں ایک خاص امتیاز کا حامل ہے۔ ان کے عہد میں مسلمانوں کی حدودِ سلطنت جتنی وسیع ہوئی وہ اس سے پہلے کسی خلیفہ کے عہد میں نہ ہوئی اور نہ اِن کے بعد کسی خلیفہ کے عہد میں باقی رہی۔ ۹۷۴ھ میں ان کا انتقال ہوگیا۔ مدتِ خلافت تقریباً ۴۸ سال رہی۔ انہوں نے اپنی رحلت سے قبل اپنی ایک روسی بیوی کے کہنے میں آکر اس کے بطن سے پیدا ہونے والے اپنے بیٹے کو اپنا جانشین بنادیا۔ لیکن ایسا کرنے سے قبل اپنی دوسری ترکی بیوی کے بطن سے پیدا ہونے والے دو بیٹوں مصطفےٰ وغیرہ کو قتل کرادیا تھا۔

۹۷۴ھ میں سلطان دوم بن سلیمانِ اعظم سریر آرائے تختِ خلافت ہوئے لیکن اُن کی نااہلی کی وجہ سے سلطنت عثمانیہ رُو بہ زوال ہوگئی، اور پھر ہوتی ہی رہی۔ یہاں تک کہ اُس کے قبضہ سے ایک کثیر رقبۂ ارض، روس اور فرانس اور پھر آخر میں برطانیہ کے قبضہ میں چلا گیا۔ مصر بھی آزاد ہوگیا۔

حجاز میں شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی نے آزادی کی تحریک شروع کی۔ والیٔ مصر محمد علی پاشا نے سلطان ترکی محمود ثانی کے حکم پر نجدیوں کے خلاف کارروائی کی اور اُن کے سردار عبداللہ بن سعود کو گرفتار کرکے قسطنطنیہ بھیجا۔ جہاں وہ قتل کردیئے گئے۔ لیکن یہ تحریکِ آزادی جاری رہی اور بالآخر حجاز میں سعودی سلطنت قائم ہوگئی۔ اور اس طرح خلافتِ ترکیہ مختلف عیسائی اور مسلم حکومتوں میں بٹ کر کمزور سے کمزور تر ہوگئی اور یورپ کے مردِ بیمار کے نام سے پکاری جانے لگی کہ ایسے میں مصطفےٰ کمال اتاترک نے نہایت جرأت وہمت سے کام لے کر اپنے چند ساتھیوں کی مدد سے ترکی میں مسلمانوں کے کھوئے ہوئے وقار کو دوبارہ قائم کیا۔ بہت سا علاقہ فتح کرکے

اپنے قبضہ میں کیا۔ انگریزوں نے مصطفےٰ کمال کے تیور دیکھ کر خلیفۂ وقت سلطان عبدالوحید سے مصطفےٰ کمال کے لئے بہ جرم بغاوت قتل کا فتویٰ صادر کرایا۔ جب پر مصطفےٰ کمال اور ان کی فوج نے عبدالوحید کو خلیفہ ہی ماننے سے انکار کر دیا۔ اس صورت حال کو دیکھ کر عبدالوحید ترکی سے بھاگ کر انگریزوں کی پناہ میں مالٹا چلا گیا۔

خاتمۂ خلافت ترکوں نے عبدالوحید کے بعد اس کے لڑکے عبدالحمید کو برائے نام خلیفہ مقرر کیا لیکن حکومت کا اختیار اتاترک کو ہی حاصل رہا۔ حکومت دستوری کے بجائے جمہوری قرار پائی جس کے صدر مصطفےٰ کمال ہی قرار پائے۔ اتاترک نے عہدۂ صدارت سنبھالنے کے بعد ۱۹۲۳ء میں خلافت کو غیر ضروری قرار دے کر اس ادارہ کو ہی ختم کر دیا۔ اور اس طرح مسلمانوں کی یہ خلافت بعدِ رسولؐ مختلف خاندانوں اور مختلف مراکز میں رہنے کے بعد اپنے نناویں اور آخری خلیفہ سلطان عبدالحمید پر ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی۔

تحریک احیار خلافت اس خاتمۂ خلافت پر دنیا کے اور دوسرے ممالک کا ردِعمل تو معلوم نہ ہوسکا لیکن ہندوستان میں علی برادران نے ۱۹۲۳ء میں تحریک احیائے خلافت بڑے زور شور سے جاری کی۔ اور اس سلسلہ میں ایک وفد مصطفےٰ کمال کے پاس ترکی بھیجا گیا، لیکن انہوں نے احیار خلافت سے قطعی انکار کر دیا۔

احیار خلافت کے سلسلہ میں اُس زمانہ میں اس حدیثِ رسولؐ کا بہت چرچا ہوا کہ "من مات .... الجاھلیہ" یعنی جو مر جائے اور اپنے امام زمانہ کو نہ پہچانے وہ جاہلیت کی موت مرتا ہے۔ اس حدیث کو احیار خلافت کی بنیاد بنا کر تمام ہندوستان میں اس کا چرچا کیا گیا، اور علی برادران کی مادر گرامی کا یہ ارشاد بچے بچے کی زبان پر تھا۔

بولی اماں یہ شوکت علی کی
جان بیٹا خلافت پہ دینا

مسلمانوں کی تاریخ میں مندرجہ بالا حدیث صرف دو مواقع پر پیش ہوئی۔ پہلا موقع وہ تھا کہ جب عبداللہ بن عمر گورنر مدینہ کے ہاتھ پر یزید بن معاویہ کی بیعت کرنے رات کے

وقت پہنچے تو اس نے کہا کہ رات کو آنے کی کیا ضرورت تھی دن کو بیعت کر لیتے۔ اس کے جواب میں آپ نے اسی حدیث کو پیش کر کے فرمایا کہ "اگر میں بغیر بیعت کئے رات کو ہی مر جاتا تو پھر میں جاہلیت (کفر) کی موت مرتا جو مجھے گوارا نہ تھی" اور دوسرا موقعہ اس حدیث کے پیش ہونے کا علی برادران کی تحریک احیار خلافت پر تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نصب خلیفہ کس قدر ضروری ہے۔ لیکن افسوس کہ تحریکِ احیار خلافت کامیاب نہ ہو سکی اور ۱۹۲۳ء سے آج تک مسلمان بے امام و بے خلیفہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔

نصبِ خلیفہ کی اہمیت تاریخ الخلفار کے مصنّف علامہ جلال الدین سیوطی نے ایک اور حدیث رسولؐ کے ذریعہ اپنی کتاب میں بیان فرمائی ہے جو اس کتاب کے اُردو ترجمہ سے من وعن نقل کی جارہی ہے۔

اُردو ترجمہ تاریخ الخلفار از اقبال الدین احمد صاحب مطبوعہ نفیس اکیڈمی صفحہ ۲۹-۳۰

"بارہ خلفار کی وضاحت

رسول اکرمؐ کا یہ ارشاد کہ بارہ خلفار کے بعد پھر فتنہ و فساد ہو گا اس کی صاف تشریح یہ ہے کہ بارہ خلفار کے بعد ملک میں فتنہ و فساد اور خوں ریزی کا بازار گرم رہا اور مزید ناحق خونریزی ہوتی رہی۔ بعض لوگوں کا بیان ہے کہ بارہ خلفار آغازِ اسلام سے قیامت تک کے درمیان ہوں گے اور حق پر رہیں گے، اور یہ ضروری نہیں کہ اُن کا زمانہ باہم مسلسل ہو۔ ان لوگوں کے اس بیان کی تائید اس قول سے ہوتی ہے جو مسدد نے اپنی مسند کبیر میں تحریر کیا ہے۔ "دینِ حق پر چلنے والے ہدایت کے علمبردار بارہ خلفار ہونے تک جن میں اہلبیت کے بھی دو افراد شامل ہیں جب تک خلافت نہ کر لیں گے اس وقت تک اُمت مسلمہ ہلاک و برباد نہ ہو گی اور سرور عالم کا یہ ارشاد کہ اس کے بعد پھر فتنہ و فساد ظہور پذیر ہو گا" اس حدیث کا مطلب یہ ہو گا کہ فتنہ و فساد کا زمانہ خروجِ دجّال سے لے کر قیامت تک کا زمانہ ہو گا۔

لیکن میں جلال الدین سیوطی کہتا ہوں کہ رسول اکرم نے جن بارہ خلفار کی بابت ارشاد فرمایا ہے ان کے نام درج ذیل ہیں۔ چاروں خلفار راشدین، امام حسن، حضرت معاویہ، ابن زبیر، عمر بن عبد العزیز یہ آٹھ ہوئے۔ انھی خلفار میں المہدی کو بھی شامل کرنا چاہیئے کیونکہ عہد عباسی میں یہ ویسے ہی نصفت شعار عادل ہوئے جیسے بنو اُمیّہ میں عمر بن عبد العزیز گزرے ہیں۔ دسواں

خلیفہ الطاہر کو شمار کیا جائے، اس لئے کہ یہ عدل و انصاف کا پیکر تھا۔ ان دس کے بعد دو خلفائے منتظر باقی رہے جن میں سے ایک امام مہدی ہیں جو اہلبیت میں سے ہوں گے "۔ علامہ جلال الدین سیوطی صاحب کی عبارت ختم ہوئی، اگر ناظرین اس بارے میں زیادہ وضاحت حاصل کرنا چاہیں تو پھر اسی کتاب تاریخ الخلفاء کے صفحہ ۲۴ سے صفحہ ۳۰ تک کی پوری عبارت ملاحظہ کر لیں۔ سیوطی صاحب کی مندرجہ بالا عبارت پڑھنے کے بعد کوئی بھی شخص خلافت و امامت کے بارے میں خواہ کسی نتیجہ پر پہنچے، یعنی وہ جس کسی کو بھی خلیفۂ رسول تسلیم کرے خواہ مسلسل و بلافصل یا درمیان میں فصل کرتے ہوئے ایک خلیفہ کے بہت عرصہ بعد دوسرے خلیفہ کو اور اس طرح وہ اپنی بارہ کی تعدادِ خلفاء پوری کرے۔ لیکن ایک بات بہت ہی واضح ہے کہ ان احادیث کی رُو سے خلافت ایک امرِ دین میں شامل ہے۔ اس کی تصدیق قرآن کی بہت سی آیات سے بھی ہوتی ہے یہاں صرف دو آیات پیش کی جاتی ہیں۔ سورۂ بنی اسرائیل آیت کا نشان ۷۱ و ۷۲ ۝ یوم ندعوا .... اضل سبیلا ۝

ترجمہ:۔ اُس دن جب ہم تمام انسانوں کو اُن کے اماموں کے ساتھ بلائیں گے تو جن کا نامۂ اعمال ان کے داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا تو وہ لوگ اپنا نامۂ اعمال پڑھنے لگیں گے اور اُن پر ریشہ برابر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ اور جو شخص اس (دُنیا) میں اندھا رہا وہ آخرت میں بھی اندھا ہی رہے گا اور راستہ سے بہت بھٹکا ہوا۔

تشریح:۔ قیامت کے دن تمام بنی نوع انسان کے مختلف گروہ اپنے اپنے اُن پیشواؤں اور لیڈروں کے ساتھ دربار خداوندی میں پیش ہوں گے جن کے بنائے ہوئے طریقہ پر وہ اپنا سفر زندگی طے کر رہے تھے۔

اس نص قرآن اور نصوصِ رسول کے بعد کسی مسلمان کو بھی یہ چارہ نہیں رہتا کہ وہ خلافت و امامت کو ایک امر دین سے علیحدہ کر دے۔ لیکن مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ اس خلافت یا امامت کو نہ تو اپنے ارکانِ اسلام میں شامل کرتا ہے نہ شرائط ایمان میں داخل کرتا ہے۔ گویا اصولی اور فروعی دونوں طریقہ سے وہ خلافت و امامت کو جزو دین نہیں سمجھتا، تو آخر کس وجہ سے اور کس بنیاد پر وہ مسلمانوں کے فرقۂ شیعہ کے خلاف پاکستان کی عدالتوں میں مقدمات دائر

کر رہا ہے۔ جبکہ شیعہ اصولی طور پر خلافت و امامت کو جزو دین سمجھتے ہیں اور اپنے عقائد کو زبردستی کسی سے منوانے کی کوشش نہیں کرتے تو پھر کیا وجہ ہے کہ اس بڑے طبقے کے چند افراد شیعوں کے خلاف صف آرا رہ ہو کر اُن کو اُن کے مذہبی عقائد کے مطابق عبادات بجا لانے پر حارج اور مانع ہوتے ہیں۔ کیا یہ مداخلت فی الدین نہیں ہوگی؟ یقیناً یہ مداخلت فی الدین ہے جو حقوقِ انسانی کے عالمی منشور اور پاکستانی قانون کی رُو سے قابلِ تعزیر جرم ہے۔ اگر شیعہ اپنے دین میں اس مداخلت کو بنیاد بنا کر ان مستغیثوں کے خلاف جوابی دعویٰ دائر کر دیں تو کیا وہ حق بجانب نہ ہوں گے؟ اور کیا حکومتِ پاکستان اس غلط استغاثہ اور اس کی وجہ سے پاکستان کے دو بڑے فرقوں کے درمیان افتراق و انتشار اور پھر اشتعال پیدا ہو کر بدامنی کی فضا پیدا ہو جانے کی صورت میں ان استغاثہ دائر کرنے والوں کے خلاف ملکی قانون کے تحت کوئی کارروائی کرنے میں حق بجانب نہ ہوگی؟ کیا ماہرینِ قانون اس قانونی نکتہ پر غور فرمانے کی زحمت کریں گے۔

تبرکاتِ رسولؐ

ناظرین کو یاد ہوگا کہ پہلے ترکی خلیفہ سلیم اوّل نے بادشاہ مصر پر فتح پا کے اس کے تنخواہ دار خلیفہ متوکل کو ترکی لا کر اُس سے منتقلی خلافت کے وقت رسول اللہؐ سے منسوب ایک عَلَم، ایک چادر اور ایک تلوار بطور تبرک حاصل کرکے اپنی خلافت کو مُستند کیا تھا۔ اور انہی تبرکات کو کام میں لا کر ایک ترکی خلیفہ محمود ثانی نے باغیوں کا مقابلہ کرکے اور انہیں شکست دے کر اپنی حکومت کو بچایا تھا۔ یعنی اُنہوں نے عَلَم رسولؐ بلند کرکے تمام مسلمانوں کو اپنی طرف کر لیا تھا۔ اب ذرا تھوڑا سا غور اس پر بھی کر لیا جائے تو بہتر رہے گا۔

متذکرہ بالا عَلَم و چادر و تلوار جو اسناد خلافت کے طور پر کام آتے رہے، اگر واقعی رسول اللہ کے تھے تو پھر یہ ترکۂ رسولؐ ہوئے اور بعد رحلت رسولؐ حضرت ابوبکر نے منصبِ خلافت سنبھالنے کے وقت باغ فدک کی طرح ان کو بھی اولاد رسولؐ سے اپنے قبضہ میں لئے ہوں گے کیونکہ قضیہ فدک کے دربار خلافت میں پیش ہونے کے وقت حضرت ابوبکر کی بیان کردہ حدیث "نحن معشر الانبیاءَ لا نوَرِث" کی رُو سے ترکۂ رسولؐ کی حقدار خلافت تھی اور اس طرح حضرت ابوبکر نے یہ تبرکات اپنے جانشین حضرت عمر کو دیئے ہوں گے۔ انہوں نے بذریعہ عبدالرحمن بن عوف حضرت عثمان کو دیئے ہوں گے اور پھر باغیانِ خلافتِ حضرت عثمان نے بعد شہادتِ حضرت عثمان یہ تبرکات جو

اُن کو مالِ غنیمت کے طور پر ملے ہوں گے حضرت علی کے سپرد کیے ہوں گے۔ انہوں نے حضرت
امام حسن کو دیئے ہوں گے اور انہوں نے خلعِ خلافت کے وقت حضرت معاویہ کی تحویل میں کر دیئے
ہوں گے، اور انہوں نے اپنے بیٹے یزید کو دیئے ہوں گے۔ پھر یہ سلسلہ وار چلتے ہوئے بنی اُمیہ
کے آخری خلیفہ مروانِ ثانی تک پہنچے ہوں گے اور ان سے عباسی خلیفہ سفاح نے بزورِ طاقت چھین
کر اپنی خلافت کو مستند کیا ہوگا۔ یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ اموی شہزادہ عبدالرحمان یہ تبرکات کیوں
حاصل نہ کر سکا اگر اسے یہ تبرکات مل جاتے تو پھر اموی خلافت اسپین ہی مسلمانوں کی اصلی اور مستند
خلافت قرار پاتی۔ بہرحال یہ تو خدا کی دین ہے جس کو چاہے دے۔ چنانچہ یہ تبرکات خاندانِ
عباسیہ میں سفاح سے لے کر آخری خلیفہ معتصم تک پہنچے ہوں گے۔ مگر حیرت انگیز طور پر ہلاکو خان کی
لوٹ مار سے بچ گئے نہ معلوم کس طرح اس خاندان کے ایک شہزادے ابوالقاسم (جس کے بارے میں مورخین
میں اختلاف ہے کہ یہ خاندانِ عباسیہ سے تھا بھی یا نہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ شاہِ مصر نے اپنی سیاسی
مصلحت کی بنا پر اس کو عباسی شہزادہ مشہور کر کے اپنی حکومت کو مستحکم کیا تھا) کے ہاتھ
لگے اور وہ تین سال تک اُن کو چھپائے رہا، اور پھر مصر میں اپنی خلافت کے ثبوت میں پیش کرتے
ہوئے اُن کو اپنے پندرہ جانشینوں تک پہنچنے کا بندوبست کر گیا۔ پھر یہ تبرکات خلفاء عثمانیہ میں
نسل در نسل منتقل ہوتے ہوئے آخری خلیفہ سلطان عبدالمجید تک پہنچے ہوں گے لیکن اس آخری
خلافت کے بعد پتہ نہیں چلتا کہ وہ تبرکاتِ رسولؐ کہاں گئے۔ کیا کوئی مسلمان اس کی نشاندہی کر
سکتا ہے؟ کیونکہ موئے مبارکِ رسولؐ اور جبۂ رسولؐ کا اور اُن کی زیارات کرانے کا تو عام چرچا
رہتا ہے مگر ان تبرکاتِ رسولؐ کا ذکر کہیں نہیں ہوتا۔

اموی خلافت (اسپین)

خلافتِ بنی اُمیہ دمشق کے بعد اگرچہ عباسیوں نے اس خاندان کے بچے بچے کو قتل کر دیا تھا لیکن
اس کا ایک شہزادہ عبدالرحمان الداخل کے نام سے ۱۳۸ھ میں عباسی خلیفہ کے گورنر کو شکست دے کر
اسپین کا حکمران بن گیا تھا۔ اس کے بعد ۴۲۲ھ تک اس خاندان کے تقریباً چودہ پندرہ حکمران
اسپین پر حکومت کرتے رہے۔ ان حکمرانوں میں حکم اول بہت مشہور ہوا۔ اس نے اپنی حکومت

کے استحکام کے لئے اپنے ہی ہم مذہب ہزاروں علمار اور لاکھوں مسلمانوں کا قتلِ عام کیا۔ بعض قرطبہ کی تباہی اور یوم الخندق کے واقعات انسانوں کی عبرت کے لئے کافی ہیں اور بہت سبق آموز ہیں۔

تین متوازی خلافتیں ۲۹۷ھ میں مصر میں فاطمی خلافت کے قیام کے بعد امویوں نے بھی اسپین میں اپنی خلافت کا اعلان کر دیا۔ اس طرح اس وقت مسلمانوں میں تین متوازی خلافتیں قائم تھیں۔ (۱) اموی خلافت اسپین (۲) فاطمی خلافت مصر (۳) عباسی خلافت بغداد۔

اموی خلافت اسپین ۴۲۲ھ میں ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی اور اسپین کے علاوہ اور کسی جگہ مقبول نہ ہو سکی۔ اس خلافت کے خاتمہ کے بعد اگرچہ مسلمان مزید چار سو سال تک اسپین پر حکمران رہے لیکن آپس میں ہی لڑ لڑا کر اور اپنی طاقت گنوا کر عیسائیوں کے مفتوح بن گئے، اور آخر کار ۸۹۷ھ میں اپنی آخری ریاست غرناطہ پر عیسائیوں کا قبضہ کرا کے وہاں سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے۔

غرناطہ اسپین میں اپنے آٹھ سو سالہ دورِ اقتدار میں مسلمانوں نے ہر قسم کے علوم و فنون میں ترقی کی بہت سی ایجادات ہوئیں۔ زراعت و تجارت و صنعت و حرفت میں بہت ترقی ہوئی خاص طور سے فنِ تعمیر اپنے عروج پر پہنچا۔ ہزاروں شاندار مساجد اور محلات تعمیر ہوئے۔ قصر زہرا اور مسجد قرطبہ آج بھی لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کئے بغیر نہیں رہتا۔ اور علامہ اقبالؔ نے تو مسجد قرطبہ کے عنوان سے ایک نظم لکھ کر مسلمانوں کے عروج و زوال کا نقشہ کھینچ دیا ہے۔

فاطمی خلافت (مصر)

خلفار بنی اُمیہ دمشق کے ستائے ہوئے بنی ہاشم اور محبانِ اہلبیت نے ہمیشہ جد و جہد جاری رکھی۔ اُنھیں جب بھی موقع ملتا اپنی حُریت کے لئے جہاد کرتے۔ بنی ہاشم کی ایک شاخ بنی عباس نے اس جہادِ حریت میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اُن کے ساتھ خانوادہ رسالت کے ائمہ کو چھوڑ کر اور دیگر اولادِ علیؑ و اولادِ حسنؑ و اولادِ حسینؑ و اولادِ سید سجادؑ علیہا السلام شریک رہی۔ جب ابوالعباس سفاح عباسی نے اہلبیت کے نام پر اپنی حکومت قائم کر لی تو انھوں نے اہلبیتِ رسولؐ میں سے

آلِ علیؑ، آلِ حسنؑ اور آلِ امام حسینؑ و آلِ سید سجاد کو بنی اُمیہ کی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ تختۂ ظلم بنایا۔ سفاح کے عہد تک تو یہ مظالم خفیہ رہے لیکن منصور کے عہد میں علانیہ ہونے لگے۔ ردِعمل کے طور پر اولادِ علیؑ و فاطمہؑ نے بھی اپنی اپنی خلافتوں کا اعلان کر کے بنی عباس کے خلاف اپنی حکومتوں کے قیام کی کوششیں شروع کر دیں۔ ابتدا میں ان کی یہ کوششیں ناکام رہیں مگر وہ مسلسل جدوجہد کرتے رہے۔ بالآخر امام جعفر صادق علیہ السلام کے ایک بیٹے اسمٰعیل کی اولاد میں سے ابو عبداللہ المہدی نامی نے ایک شخص حسین شیعی کی مدد سے ۲۹۷ھ میں افریقہ کے حکمران اغلبی خاندان کو ختم کر کے عباسیوں کے متوازی فاطمی خلافت قائم کر لی۔ جس کا پہلا دار الخلافہ رقادہ قرار پایا۔ فاطمی خلیفہ المہدی کو اپنا اقتدار مستحکم کرنے کے لئے کئی مسائل کا سامنا تھا۔ آپ نے تمام مسائل کو حکمتِ عملی کے ذریعہ حل کیا اور فاطمی خلافت کی بنیادیں اتنی مضبوط کر دیں کہ وہ کافی عرصہ تک قائم رہی۔ آپ نے بغاوتوں اور شورشوں کا سدباب کیا۔ عبداللہ شیعی کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو اُسے اور اس کے بھائی کو قتل کر کے اسی طرح ختم کیا، جس طرح عباسی خلیفہ منصور نے ابو مسلم خراسانی کو قتل کر کے ختم کیا تھا۔

قاہرہ فاطمی خلفاء میں المعز کا دور بہت شاندار کہا جاتا ہے۔ ان کے عہد میں مصر و شام و مغرب اقصیٰ بھی حدودِ سلطنت میں شامل ہو گیا تھا، اور خاص بات یہ ہے کہ فاطمیوں کا دار الخلافہ فتح مصر کے بعد مستقل طور سے مصر بن گیا تھا۔ جہاں ایک بہت بڑی یونیورسٹی جامع ازہر کے نام سے قائم کی گئی جو آج بھی اسی نام سے قاہرہ (مصر) میں موجود ہے۔

مذہبی تعصب فاطمی خلفاء میں الحاکم بامر اللہ اپنے کچھ کارناموں کی وجہ سے بہت مشہور ہوئے۔ آپ متلون مزاج ہونے کے ساتھ ساتھ متشدد اسمٰعیلی شیعہ تھے۔ یہودیوں اور عیسائیوں کے دشمن ہونے کے ساتھ فرقۂ اہلسنت کے بھی بہت خلاف تھے۔ آپ نے یہودیوں اور عیسائیوں کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ رہنے کے لئے اُن کو اُن کے مخصوص لباس اور مخصوص نشان سے پہچانے جانے کے لئے عیسائیوں کو کالے لباس کے ساتھ گلے میں صلیب لٹکانے اور یہودیوں کو زرد لباس کے ساتھ گلے میں گائے کے بچھڑے کی تصویر لٹکانے کا حکم دیا تھا۔ تمام عورتوں کو سخت پردہ کا پابند بنایا تھا۔ شراب و غنا پر بہت سخت پابندی لگا دی تھی۔ آپ

اسمٰعیلی مذہب کی ترویج و اشاعت میں اس درجہ آگے بڑھ گئے تھے کہ دوسرے فرقہ ہائے اسلامی کے افراد کو اُن کے مذہبی اعمال و عبادت میں مداخلت کر کے اپنے عقائد کو زبردستی منوانے پر مجبور کرتے تھے۔ مثلاً نماز تراویح جو حضرت عمرؓ کے عہد سے مسلمانوں میں رائج تھی اس کو حکماً بند کرا دیا تھا۔ اسی طرح حضرت عمرؓ نے جو صبح کی اذان میں الصلوٰۃ خیر من النوم کہنے کا حکم دیا تھا اور جس پر مسلمان سختی سے عمل پیرا تھے، آپ نے اذان سے خارج کرنے کا حکم دیا تھا۔ اور اس کے بجائے اذان میں اشہد ان محمد رسول اللہ کے بعد اشہد ان علی ولی اللہ اور حیّ علیٰ الفلاح کے بعد حیّ علیٰ خیر العمل کہنے کا حکم دوبارہ جاری کیا۔ (واضح ہو کہ حیاتِ رسولؐ میں بعد واقعۂ غدیر خم گروہ مومنین جن میں سلمان فارسی، ابوذر غفاری، حذیفہ یمانی، عمار یاسر اور جابر ابنِ عبداللہ انصاری جیسے مقتدر صحابیٔ رسول شامل تھے، اپنے کلمہ و اذان میں علی ولی اللہ اور حیّ علیٰ خیر العمل کہتے تھے اور جس کو عہد حضرت ابوبکرؓ میں بمشورہ حضرت عمرؓ کلمہ و اذان سے علانیہ خارج کر دیا گیا تھا۔) آپ نے اپنے عقیدہ کے خلاف ہر عقیدہ رکھنے والوں کے مذہبی معاملات میں دخل اندازی کر کے زبردستی اپنا عقیدہ اپنانے پر مجبور کیا۔ چونکہ دین کے معاملہ میں جبر و اکراہ نہ تو سنتِ الٰہی ہے نہ سنتِ رسولؐ اور نہ سیرتِ ائمہ خانوادۂ رسالت اور نہ ہی فطرتِ انسانی کے مطابق ہے۔ لہٰذا جہاں کہیں اور جس کسی کی طرف سے مذہب کے معاملہ میں زبردستی ہوگی اس کا نتیجہ نفرت، بے چینی اور پھر بغاوت ہوگا۔ انسانی تاریخ کے ہر دور میں اس کے مظاہرے نظر آئیں گے۔ چنانچہ فاطمی خلافت کے زوال کا سبب بھی یہی ہوا۔ الحاکم کی سخت گیری کی وجہ سے ابورکوع نامی شخص نے زبردست بغاوت کی جس نے بہت خطرناک صورت اختیار کر لی، مگر الحاکم کی خوش قسمتی سے یہ بغاوت ناکام ہوگئی۔ بغاوت تو فرو کر دی گئی لیکن الحاکم کو یہ احساس ہوگیا کہ اس نے اہلسنت کے خلاف جو کارروائیاں کیں تھیں وہ سیاسی لحاظ سے غلط تھیں۔ چنانچہ انہوں نے ان احکامات کو واپس لے لیا۔

مزید یہ کہ اہلسنت کو انھیں کے فقۂ مالکی کے مطابق عبادات بجالانے کے لئے حکومت کی طرف سے امداد دینے کا حکم جاری کیا۔ (واضح ہو کہ اُس وقت مصر میں فقۂ مالکی پر عمل پیرا اہلسنت کی اکثریت تھی)

فاطمی خلفاء نے اپنے اقتدار کے قیام کے لئے پہلے بربروں سے کام لیا، پھر ترکوں کو حکومت میں دخیل کیا جس کا نتیجہ ترکوں اور بربروں کے درمیان جنگ کی صورت میں نکلا۔ جس میں بربروں کو اقتدار سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو جانا پڑا۔ لیکن عباسی خلافت کی طرح فاطمی خلافت بھی ترکوں کے اثر میں آکر کٹھ پتلی خلافت بن کے رہ گئی۔

پہلے فاطمی خلیفہ المہدی ۲۹۷ھ سے لے کر آخری خلیفہ العاضد ۵۶۷ھ تک تقریباً چودہ خلفائے فاطمین نے ایک بڑے رقبۂ زمین پر، اپنے اقتدار کو باقی رکھا۔ اپنے دورِ حکومت میں انہوں نے بہت سے رفاہی کام بھی کیے اور ہر قسم کے علم و فن کی ترقی کے ساتھ اُس کی ترویج و اشاعت کی خود نگرانی کی۔ ہر علم کے عالموں اور ہر فن کے ماہروں کو اپنے یہاں جمع کیا۔ فنِ تعمیر میں بھی وہ کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ قاہرہ کا خوبصورت شہر، اُس کے محلات، اُس کی مساجد، درس گاہیں اور سرائیں و بازار وغیرہ اُن کی نفاستِ طبع کا پتہ دے رہی ہیں۔ اُن کی قائم کردہ جامعِ ازہر آج بھی حصولِ علم کا ایک بہت بڑا مرکز ہے۔

صلاح الدین ایوبی

۵۶۷ھ میں سلطان صلاح الدین ایوبی نے آخری فاطمی خلیفہ العاضد کے انتقال کے بعد خود حکومت پر قبضہ کرلیا۔ اس سے قبل صلاح الدین صاحب عاضد کے ۲ دو سال تک وزیر رہے تھے۔ تختِ حکومت سنبھالنے کے بعد سلطان صلاح الدین ایوبی نے عیسائیوں سے صلیبی جنگیں لڑیں اور بڑا نام پیدا کیا۔ انہوں نے اپنی حکومت کا الحاق عباسی خلافت سے کرلیا تھا۔ تقریباً اسی سال تک اس خاندان کے افراد مصر پر حکومت کرتے رہے۔

آغاخانی شیعہ

فاطمین اپنی ظاہری حکومت و خلافت کے خاتمہ کے بعد روحانی طور سے ۲ دو حصوں میں تقسیم ہو گئے اور آج بھی اپنے کروڑوں پیروؤں پر اپنا روحانی اقتدار رکھتے ہیں۔ ان میں سے ایک فرقہ ہز ہائی نس شہزادہ کریم آغا خان کو اپنا حاضر اور موجودہ امام تسلیم کرکے ان کی پیروی کرتا ہے اور آغا خانی اسمٰعیلی شیعہ کے نام سے موسوم ہے۔ ہندوستان، پاکستان، افریقہ، مصر، زنجبار، یورپ و امریکہ غرض کہ دنیا کے ہر حصہ میں اس فرقے کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ زیادہ تر تجارت پیشہ ہیں۔

بوہری شیعہ ان کا دوسرا فرقہ بوہری فرقہ کہلاتا ہے جو اپنے موجودہ پیشوا سیدنا برہان الدین کو نائب امام سمجھ کر اُن کی تقلید کرتا ہے۔ ہندستان، پاکستان، افریقہ و مصر، ایران وعرب، یورپ و امریکہ غرض کہ دنیا کے ہر حصہ میں آباد ہیں۔ تجارت پیشہ افراد اس فرقہ میں بھی زیادہ پائے جاتے ہیں۔

اغراض و مقاصد

ادارۂ فروغِ انسانیت

۱۔ انسانوں کی فلاح و بہبود کے لئے سعی کرنا اور اس کے لئے دوسرے فلاحی اداروں سے بھی تعاون کرنا۔

۲۔ اسلام کے خلاف تمام لادینی حملوں کا دفاع کرنا اور حق کی ترویج و اشاعت کی کوشش کرنا۔

بانیانِ ادارہ

۱۔ علّامہ طالب جوہری مدظلہٗ

۲۔ سیّد قمر حسن رضوی

۳۔ سیّد تقی ہادی نقوی (ایم اے)

۴۔ سیّد محمد عباس قمر زیدی (مرحوم)

۵۔ سیّد مسرور حسن رضوی (بی اے)

باب چہارم

صراطِ مستقیم

خلافتِ الٰہیہ

معرفتِ الٰہی

خلفاءِ الٰہی کے تذکرہ سے قبل ضروری ہے کہ تھوڑی سی معرفت اُس خدا کی بھی ہو جائے جس کا خلیفہ بن کر انسان زمین پر آیا، اور یہ صرف اس لئے کہ کچھ ذواتِ مقدسہ کے علاوہ، جو خدا کے مصطفےٰ اور مرتضےٰ بندے ہیں، دنیا کا کوئی انسان حقِ معرفت ادا نہیں کر سکتا۔ پروردگارِ عالم خود اپنے کلام میں ارشاد فرماتا ہے کہ اگر دنیا کے سارے سمندر سیاہی بن جائیں، سارے درخت قلم بن جائیں اور سارے آسمان کاغذ ہوں اور تمام جن و انس مل کر کلماتِ الٰہی کا احصار کرنا چاہیں تو ہرگز نہیں کر سکتے، اور نہ اس کی قدرت کو جان سکتے ہیں۔

خالقِ کائنات، اپنے حبیب کی زبانی ایک حدیثِ قدسی میں اپنی معرفت اس طرح کراتا ہے کہ "میں ایک خزانۂ مخفی تھا، جب میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں تو میں نے مخلوق کو خلق کیا"۔ وہ اوّل مخلوق حضور کی ایک حدیث "اوّل ما خلق اللہ نوری" یعنی سب سے پہلے اللہ نے میرے نور کو خلق کیا کے مطابق خود آنحضور ہی کی ذاتِ بابرکات ہے۔

ذرا خیال تو کیجیے کہ جب کچھ بھی نہ تھا، نہ زمین تھی نہ آسمان، نہ عرش تھا نہ کرسی، نہ سورج تھا نہ چاند، نہ یہ ستارے اور نہ یہ سیارے، ایک خلائے بسیط تھی، ایک ہُو کا عالم تھا۔ بس اُس خالقِ کائنات کی ذات یکتا تھی، جو نہ کسی سے پیدا ہوا، نہ اس سے کوئی پیدا ہوا، نہ اس کی کوئی بیوی ہے اور نہ اس کا کوئی بچہ، نہ اُس کا کوئی جسم ہے نہ صورت، نہ اس کا کوئی مکان ہے اور نہ سمت و جہت۔ وہ کبھی کسی میں حلول نہیں کرتا۔ نہ وہ کبھی دیکھا گیا اور نہ کبھی دیکھا جاسکے گا۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ وہ حیّ قیوم ہے۔ نہ اُسے نیند آتی ہے نہ اونگھ۔ وہ صمد ہے کسی چیز کا محتاج نہیں۔ نہ تو دیکھنے کے لئے آنکھ کا، نہ سننے کے لئے کان کا، نہ کام کرنے کے لئے ہاتھوں کا، نہ چلنے کے لئے پیروں کا، نہ سوچنے کے لئے دماغ کا، غرض کہ وہ ہر چیز سے بے نیاز ہے۔ اُس کی صفات اس سے جُدا نہیں۔ اگر وہ علیم ہے تو عینِ علم ہے۔ اگر عادل ہے تو عین عدل ہے۔ اگر رحیم ہے تو عینِ رحم ہے۔ اس طرح وہ کسی صفت کا موصوف نہیں ہے بلکہ عینِ صفت ہے۔ کوئی بینائی اس کو نہیں پاسکتی۔ کوئی عقل اس کا ادراک نہیں کرسکتی۔ وہ اپنی ہر مخلوق سے قریب تر ہے۔ کائنات کی ہر شے اس کے احاطہ علم میں ہے۔ مگر کوئی شے اس کے مثل نہیں ہے۔ ہاں اس کی معرفت و جود کائنات کے ذرہ ذرہ سے ہوسکتی ہے۔ اس نے کچھ ایسی مخلوق بھی اس دنیا میں خلق کی ہے جو دکھی تو نہیں جاتی لیکن اس کے وجود کے سب قائل ہیں۔ مثلاً ہوا، روح، جنّات وغیرہ وغیرہ۔ اور یہ سب اس لئے کہ انسان اس اَن دیکھے خدا کے وجود کا قائل ہو جائے جس نے تمام کائنات کو ایک مقررہ نظام کے تحت خلق کیا ہے۔

اس کائنات میں بہت سے نظام ہائے شمسی ہیں جو ایک مقررہ اصولِ عدل کے تحت اس خلائے بسیط میں سرگرم عمل ہیں۔ اُن میں سے ایک نظامِ شمسی جو ہماری دنیا سے متعلق ہے، کے بارے میں ہی اب تک یہ خاکی انسان پورے طور سے آگاہ نہیں ہوسکا ہے تو اور دیگر نظام ہائے شمسی کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہے۔

مذہب اور سائنس اب سے تین چار سو سال قبل تک انسان اس زمین کو جامد خیال کرتا تھا، اس کو سیّار خیال کرنا دین و مذہب کے خلاف اور قابلِ تعزیر جرم سمجھتا تھا۔ چنانچہ جب ایک سائنسداں گلیلیو نامی نے زمین کے متحرک ہونے کا نظریہ پیش کیا،

تو اس کو اس کی حکومت نے اس جرم کی پاداش میں سزائے موت دے دی مگر اس نے مرتے مرتے بھی کہہ دیا کہ ایک وقت آئے گا جب تمہیں میرے دعویٰ کی تصدیق ہو جائے گی۔ چنانچہ زمانہ گزرا اور زمین کو سیارہ مان لیا گیا۔ اور آج سائنس اس درجہ پر پہنچ گئی کہ انسان نے زمین کے کرۂ ہوا سے نکل کر، چاند کے مدار میں داخل ہو کر تسخیر قمر کر لی۔ اب اس کا نشانہ مریخ ہے۔ اس کا بھی امکان ہے کہ اسی طرح اور دوسرے سیارگان جو اس نظام شمسی سے مربوط ہیں مسخر کر لئے جائیں۔ یہ بات نہ تو تعجب کی ہے اور نہ خلافِ اسلام ہے۔

خالق کائنات نے اپنی تمام مخلوق کو انسان کے لئے مسخر کر دیا ہے۔ اور اس کو اشرف المخلوقات بنا کر اپنی نیابت کا تاج اس کے سر پر رکھ دیا ہے۔ وہ علیم و خبیر جانتا تھا کہ ایک وقت ایسا آئے گا جب انسان سائنس میں ترقی کرتے کرتے ہماری قدرت کو بھول جائے گا۔ اپنی عقل پر بھروسہ کر کے ہمارے وجود سے ہی منکر ہو جائے گا، ہمارے دین کو ناقص خیال کر کے خود اپنے انفرادی اور اجتماعی نظامِ حیات وضع کرے گا۔ ہمارے قانونِ حیات پر جو قرآن کی صورت میں اور اس سے پہلے اور دیگر آسمانی کتابوں اور صحائف کی صورت میں دیئے گئے ہیں اعتراض کرے گا، تو اس نے چودہ سو سال پہلے ہی اس نظام شمسی کے بارے میں قرآن مجید کے سورۂ یٰسین کی آیت ۳۸ تا ۴۰ میں ٥ والشمس تجری ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ وکل فی فلک یسبحون ٥ ترجمہ:۔ اور سورج اپنے مستقر کی طرف حرکت کرتا ہے۔ یہ غالب اور علیم کا مقرر کیا ہوا نظام ہے۔ اور ہم نے چاند کی منزلیں مقرر کر دیں، یہاں تک کہ وہ کھجور کی ایک پرانی ٹہنی کے مانند معلوم ہونے لگتا ہے اور یہ یہ سب کے سب اپنے مدار پر گردش کر رہے ہیں کہہ کر اس بلاغت سے حرکت سیارگان کا ذکر کر دیا کہ اس دور کے محدود النظر انسان اس پر اعتراض نہ کر سکے۔ اگر خالق کائنات ظاہر بظاہر زمین کا سیارہ ہونا بیان کر دیتا تو عام لوگوں کے علاوہ وہ مسلمان بھی جن کے دلوں میں ایمان یا تو داخل ہی نہیں ہوا تھا یا داخل ہونے کے بعد پختہ نہ ہوا تھا، وہ رسول اللہ کو یا تو اس جرم میں قتل کر دیتے یا اسلام ہی سے برگشتہ ہو جاتے، وہ لوگ تو ویسے ہی رسول اللہ کو ساحر و مجنون و گمراہ کہنے سے نہیں چوکتے تھے۔ پھر زمین کے متحرک ہوتے کا نظریہ تو ان کے لئے اور بھی عجیب و غریب ہوتا۔ اسی لئے خالقِ کائنات نے کل فی فلک یسبحون کہہ کر نظام شمسی سے منسلک تمام سیاروں

کو جن میں یہ زمین بھی شامل ہے اپنے اپنے مدار پر اس طرح گردش کرنے کو کہ ایک سیارہ دوسرے سیارہ سے کبھی نہیں مل سکتا، بہت پہلے بتا دیا تھا۔ لیکن مسلمانوں نے ان سائنسی علوم کو خلافِ مذہب قرار دے کر اس سے استفادہ کی کبھی کوشش نہیں کی۔ مگر ان علوم سے مغربی اقوام کے استفادہ کو دیکھ کر پہلے تو ان سے مرعوب ہوئے اور پھر اُن سے مغلوب ہو گئے۔

قدرتِ خدا اللہ اکبر اس قادر مطلق خالقِ حقیقی اور صانع یکتا نے اپنی قدرت کاملہ سے ان سیارگان کو جن کی جسامت اور وزن کا حساب بھی مشکل سے ہوتا ہے اس فضائے بسیط میں معلق کر کے گردش دے رکھی ہے۔ کیا کوئی عقل اس بات کو تسلیم کر سکتی ہے کہ یہ ساری کائنات بغیر کسی بنانے والے کے خود بخود بن گئی ہے۔ اور بغیر کسی چلانے والے کے خود بخود چل رہی ہے۔ ضرور اس کا کوئی بنانے والا اور اس کو چلانے والا ہے اور وہ وہی خدا ہے جس کو مختلف قوموں میں مختلف ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ اسی کو سپر پاور بھی کہتے ہیں، ایک عظیم طاقت جس کا حکم کائنات کے ذرّہ ذرّہ پر حاوی ہے۔ اور پھر اس عدل کے ساتھ کہ جو اصول ایک ذرّہ میں پروٹون، الیکٹرون اور نائٹرون کی صورت میں موجود ہے۔ وہی اصول پورے نظام شمسی میں جاری و ساری ہے۔ اسی لئے اس قادرِ مطلق نے کہا کہ ”کوئی ذرہ اُس کے حکم کے بغیر حرکت نہیں کر سکتا“ آج کے سائنسداں سائنس کی اس ترقی کے باوجود ایک ذرّہ کے ان عناصر کی گردش کو روکنے پر نہ تو قادر ہو سکے اور نہ ہی اس کا رخ موڑ سکے۔ لیکن وہ عظیم طاقت جس نے اس نظام کو مقرر کیا ہے اور کامیابی سے اس نظام کو چلا رہا ہے، وہ اس بات پر قادر ہے کہ جب چاہے اس حرکت کو روک دے۔ اور جب چاہے چلا دے۔ خواہ اس میں پورا نظام شمسی ہو یا اس کا کوئی سیارہ یا اس سیارہ کا کوئی ذرہ۔ وہ اس پر بھی قادر ہے کہ کائنات کی کسی شے کو یا اپنی کسی مخلوق کو اُس کی اپنی جگہ سے لے جا کر کسی اور جگہ پہنچا دے اور پھر واپس اسی جگہ لے آئے۔ وہ اس پر بھی قادر ہے کہ اپنی کسی نوع مخلوق کو معدوم کر کے اس کی جگہ کوئی اور مخلوق پیدا کر دے۔ وہ اس پر بھی قادر ہے کہ پوری کائنات یا اس کے کسی نظام یا تمام نظام ہائے شمسی میں سے کسی ایک نظام سے منسلک کسی سیارہ کو ختم کر دے۔ وہ ہر شے پر قادر ہے۔ ان اللہ علی کل شی قدیر۔

اس نے یہ زمین اجناّ اور انسانوں کے لئے خلق کی اور ان کی ابتدار سے لے کر انتہا تک ان کی تمام ضرورتوں کا پورا سامان اسی زمین میں مہیا کر دیا۔ یہی نہیں بلکہ اس نے اپنی ہر مخلوق اور اس

کے ہر فرد کے لئے رزق کا انتظام بھی اسی زمین پر کیا۔ اور اسی طرح اس نے بے شمار عوالم پیدا کئے اور اُن میں ہمارے علم سے باہر کوئی مخلوق پیدا کر کے اور ان کی پرورش کا سامان کر کے اپنے آپ کو رب العالمین کہلوایا۔

تخلیقِ کائنات

اس مختصر سے تعارف کے بعد وہ خالقِ کُل ایک تیسری حدیثِ قدسی میں ارشاد کرتا ہے "لولاک لما خلقت الافلاک"۔ یعنی (اے محمدؐ) اگر میں تجھے پیدا نہ کرتا تو یہ کائنات بھی نہ پیدا کرتا"۔ اس نے سب سے پہلے اپنی قدرت کاملہ سے ایک مجسمۂ نور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کی صورت میں خلق کیا۔ اب یا تو وہ خالقِ یکتا و بے مثال تھا یا یہ مخلوق یکتا و بے مثال تھی۔ اس مخلوقِ اوّل نے اپنے خالق کی حمد و تسبیح و تقدیس شروع کر دی اور اس قدر کی کہ احمدؐ کے لقب سے سرفراز ہوا۔ اللہ نے اس کی حمد و ثنا ادا کرنے کی خوبی دیکھ کر اس کو محمدؐ کے خطاب سے نوازا۔ اب خالقِ کائنات نے اپنی یکتائی کو قائم رکھنے کے لئے اس نورِ محمدیؐ کو شگافتہ کر کے دو۲ حصوں میں تقسیم کر دیا۔ اور اس کی تصدیق رسولِ مقبول کے اس قول سے ہوئی کہ میں اور علی ایک نور سے ہیں۔ اب خلاقِ عالم نے ان دونوں انوارِ مقدسہ کو مزید تین ٹکڑوں میں منقسم کر کے پانچ صورتوں میں جلوہ گر کیا۔ یہ پانچوں انوارِ الٰہی اپنے خالق کی عبادت میں مصروف ہو گئے۔ پھر خالقِ حقیقی نے تخلیقِ کائنات شروع کی اور اس کا تذکرہ اس نے قرآنِ مجید کے سورۂ فرقان کی آیت ۵۹ میں اس طرح کیا۔ ہ الذی ---- خبیراہ

ترجمہ:۔ جس خدا نے سارے آسمان و زمین اور جو کچھ ان سب کے درمیان ہے چھ دن میں پیدا کئے پھر عرش پر مستولی ہوا وہ بڑا مہربان ہے تو تم اس کا حال کسی باخبر ہی سے پوچھنا۔

ناظرینِ کرام یوں تو پورا قرآنِ مجید غور سے پڑھنے، سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کے لئے ہے لیکن تخلیقِ کائنات کے بارے میں خاص طور سے سورۂ فرقان کو غور و توجہ سے پڑھا جائے تو بہت سے مطالب انسان پر منکشف ہوں گے۔ بہرحال آیت کا آخری ٹکڑا فسئل خبیرا اس بات کی دلیل ہے کہ جب تخلیقِ کائنات ہو رہی تھی تو کچھ انوارِ مقدسہ اس کو دیکھ رہے تھے اور اس کی حقیقت سے باخبر تھے۔ اور اس سلسلہ میں سورۂ سجدہ کی تلاوت بھی تخلیقِ کائنات کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے۔ بہرحال ان اوّل مخلوق اور پاک بندوں کے سامنے تخلیقِ کائنات کے ساتھ ساتھ دیگر

مخلوقاتِ الٰہی بھی خلق ہوئیں۔ اِن کے سامنے تخلیق ملائکہ ہوئی، اور اُنہوں نے اِن ہی سے تسبیح و تقدیسِ الٰہی سیکھ کر، اپنے فرائض کی بجاآوری کی، اور مسلسل کر رہے ہیں۔ اِن ہی کے سامنے تخلیق اجنار ہوئی اور اس کے ایک فرد ابلیس نے خداوند قدوس کی اس درجہ عبادت کی کہ وہ معلم الملکوت ہو کر صُفوفِ ملائکہ میں شامل ہو گیا۔ اسی طرح نہ جانے اور کون کون سی مخلوق پیدا کی جس کا علم سوائے اُس کے یا ان پاک ہستیوں کے کسی اور کو نہیں ہے۔ اُس نے عالم زریں آدمؑ اور اولادِ آدمؑ کی ان تمام ارواح کو پیدا کیا جو قیامت تک اس زمین پر آئے گی۔ اور اُن سے عہد لیا کہ وہ زمین پر جا کر بھی حاکمیتِ الٰہی کو تسلیم کرتے رہیں گے۔ اور ان معلموں کی اطاعت و پیروی کرتے رہیں گے جو ان کی ہدایت کے لئے اللہ زمین پر بھیجے گا۔

اُس نے آدمؑ اور ان کی اولاد میں سے تمام انبیاء کی ارواح سے بھی اپنی حاکمیت، اپنے حبیب کی رسالت اور اپنے ولی کی ولایت کے اقرار کے ساتھ اُن کی مدد کرنے کا بھی عہد لیا۔

اب اللہ نے تخلیق انسان کر کے اُس کو زمین پر اپنا نائب مقرر کرنے کا ارادہ کیا۔ کیونکہ اس نے یہ زمین اجنار اور انسانوں کے لئے ہی مخصوص کی تھی۔ اس موقع پر حضور ختمی مرتبت کی یہ حدیث کہ "میں اس وقت بھی نبی تھا جب آدمؑ پانی اور مٹی کے درمیان منزلیں طے کر رہے تھے"، غور طلب ہے۔

اس نے اپنے ارادہ کا اظہار ملائکہ کے سامنے اس طرح کیا۔ سورہ بقر آیت ۳۰

تشریح :- میں زمین پر اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں۔ اس کے جواب میں فرشتوں نے بارگاہِ رب العزت میں عرض کیا کہ کیا تو ایسے کو خلیفہ بنائے گا جو زمین پر فتنہ و فساد و خونریزی کرے گا؟ درآنحالیکہ ہم تیری تسبیح و تقدیس کرتے ہیں۔ خدا نے اُن کو یہ کہہ کر خاموش کر دیا کہ جو ہم جانتے ہیں وہ تم نہیں جانتے۔

خلقتِ آدمؑ

اب خدا کے حکم سے پتلۂ آدم بننا شروع ہوا، اور جب صنعتِ پروردگار کا یہ نادر شاہکار بن کر تیار ہو گیا تو اُس نے اس میں اپنی روح پھونک دی جس کے بعد یہ خاکی پتلا ایک چلتا پھرتا، جیتا جاگتا انسان بن گیا۔ اب اللہ نے تمام ملائکہ اور ابلیس کو اپنی حاکمیت تسلیم ہونے کے امتحان کے لئے سجدۂ آدمؑ کا حکم دیا۔ تمام ملائکہ نے تعمیل حکم کی لیکن

ابلیس نے اس حکم کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔ جب اللہ نے اس سے انکار کا سبب دریافت کیا تو اس نے اپنی خلقت نار سے اور آدم کی خلقت مٹی سے ہونے کی وجہ سے اپنے افضل ہونے کا دعویٰ کیا، اور اپنے گمان میں ایک افضل کو مفضول کے تحت قرار دینا اللہ کا ظلم خیال کیا۔ خالق کائنات نے اس حکم عدولی کے سبب اس کو راندۂ درگاہ کردیا۔ اس نے اپنی عبادتوں کے صلہ میں قیامت تک زندہ رہنے کی مہلت مانگی۔ خدا نے اُسے ایک وقت معلوم تک کی مہلت دیدی۔ مہلت مل جانے کے بعد اُس نے رب العالمین کی عزت وجلال کی قسم کھاکر خود اللہ سے ہی کہا کہ میں تیرے بندوں کو بھکاؤں گا۔ اور اسی طرح ان کو گمراہ کرکے تیرے دربار سے نکلواؤں گا جس طرح تو نے مجھے اپنے دربار سے نکالا ہے۔ مگر ان میں تیرے مخلص بندے شامل نہیں ہیں۔ میں تیری صراطِ مستقیم پر بیٹھ کر آدمؑ اور اولادِ آدمؑ کو دائیں بائیں اور آگے پیچھے سے گھیر کر گمراہ کروں گا۔ اللہ نے بھی اس کے اس چیلنج کو قبول کرلیا اور کہا جا تجھ سے جس طرح ممکن ہو ان کو بھکا جو میرے بندے ہیں وہ تیرے بہکائے میں نہیں آئیں گے۔ اس موقع پر شاید شیطان سے چوک ہوگئی یا اس نے قصداً مزید دو سمتوں یعنی فوق وتحت کو اپنے بہکانے کے لئے اللہ سے نہیں مانگا۔ لہذا وہ ان دو سمتوں سے انسان کو کبھی نہیں بہکا سکتا۔ اگر انسان اپنے چاروں اطراف سے شیطان کے بہکائے میں آبھی جائے تو اگر وہ اپنے گناہوں سے توبہ کرکے اپنا سر جانب آسمان بلند کرکے یا سجدہ میں زمین پر رکھ کر اللہ سے معافی کا طلبگار ہوگا تو وہ ارحم الرحمین اس کی خطاؤں کو معاف کرکے اُسے نجات دے دے گا۔

فضیلتِ آدمؑ

اُدھر چونکہ فرشتوں نے اللہ کے حکم سے آدمؑ کو سجدہ تو کرلیا تھا لیکن وہ مطمئن نہ ہوں گے لہذا قدرت نے اُن کے اطمینان کے لئے حضرت آدمؑ کو کچھ اسماء کی تعلیم دی اور یہی تعلیم وہ فرشتوں کو پہلے ہی دے چکا تھا۔ اب اتمام حجت کے لئے منزل امتحان پر فرشتوں سے اِن اسماء کے بارے میں سوال کیا، وہ جواب نہ دے سکے اور کہا کہ ہم تو وہی جانتے ہیں جو تو نے ہمیں بتایا ہے۔ اس کے بعد یہی سوال حضرت آدمؑ سے بھی کیا گیا۔ انہوں نے اِن اسماء کا جواب دے دیا۔ چنانچہ ملائکہ حضرت آدمؑ کی فضیلتِ علم کے قائل ہوکر مطمئن ہوگئے۔ اب حضرت آدم علیہ السلام کے لئے جنت میں قیام کا انتظام ہوا۔ جہاں چاہیں رہیں۔ جہاں چاہیں جائیں۔ جس چیز کو دل چاہے کھائے پیئیں۔ لیکن اُن کو ایک درخت کے پاس جانے کو منع کردیا گیا،

اور کہا گیا کہ اگر اس کے پاس چلے گئے تو پھر تم اپنا نقصان خود آپ ہی کرو گے۔ چنانچہ وہ جنت میں چاروں طرف سیر کناں تھے لیکن کچھ اداس اداس سے۔ تنہائی کی وجہ سے ان کا دل نہیں لگ رہا تھا۔ نہ کھانا پینا ہی اچھا معلوم ہو رہا تھا کہ ایسے میں خالق یکتا نے اُن کے پہلو میں ان کی ہی نوع سے حضرت حوّا کو پیدا کر کے اُن کی تنہائی کو دُور کیا۔ جب حضرت آدم علیہ السلام کی نظر حضرت حوّا پر پڑی تو اُن کے دل میں محبت پیدا ہوئی اور ان کی طرف ہاتھ بڑھانا چاہا۔ وہیں آوازِ قدرت آئی کہ اے آدمؑ اگرچہ یہ تمہارے لئے ہے مگر جب تک تم اس کا مہر ادا نہیں کرو گے یہ تمہارے لئے جائز نہیں ہو گی۔ حضرت آدم علیہ السلام نے دریافت کیا۔ پالنے والے اس کا مہر کیا ہے؟ آواز آئی کہ دس مرتبہ محمدؐ و آل محمدؐ پر درود پڑھو کہ یہی اس کا مہر ہے۔ حضرت آدمؑ نے حکم خُدا کے مطابق مہر ادا کیا اور رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ (مجھے کچھ یاد آتا ہے کہ اب سے کئی سال قبل اخبار جنگ کراچی کے کسی شمارہ میں، درسِ قرآن کے عنوان کے تحت جناب احتشام الحق تھانوی صاحب نے بھی یہ واقعہ اپنی تفسیر قرآن میں تحریر فرمایا ہے)

مندرجہ بالا واقعہ میں دو باتیں اظہر من الشمس ہیں۔ اوّل یہ کہ محمدؐ و آل محمدؐ (صلی علیہ و آلہ وسلم) کا وجود قبل خلقتِ آدم و حوّا ثابت ہو رہا ہے۔ دوسری بات یہ معلوم ہو رہی ہے کہ اللہ نے بغیر نکاح اور بغیر ادائیگی مہر مرد و عورت کا اختلاط پسند نہیں کیا۔ اور اس کی دلیل یہ بھی ہے کہ اللہ نے حضرت آدمؑ کی ہونے والی نسل کے لئے قرآن کریم میں مردوں کے لئے حلال و حرام عورتوں کی اچھی طرح وضاحت کر دی ہے تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ تھانوی صاحب نے کس بنیاد پر اخبار جنگ کراچی کے ۳۱ دسمبر ۱۹۷۶ء کے جمعہ ایڈیشن میں اپنی تفسیر قرآن میں حضرت آدم علیہ السلام کے بعد حضرت نوحؑ کے زمانہ تک قرآن کی حرام کردہ عورتوں سے نکاح جائز قرار دیا ہے۔ جبکہ سنت الٰہیہ تبدیل نہیں ہوتی۔ گویا اس طرح تھانوی صاحب نے قابیل و ہابیل و حضرت شیثؑ کے علاوہ حضرت نوح علیہ السلام تک معہ اُن کے، تمام اولادِ آدمؑ کی پیدائش ناجائز طریقہ پر ماں، بہن، پھوپی، خالہ وغیرہ کے بطن سے ہونا ثابت کیا ہے۔ اگر ان کی تفسیر کو صحیح مان لیا جائے گا تو پھر حضور ختمی مرتبت محمد مصطفےٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا پاک اصلاب اور طاہر ارحام میں منتقل ہوتے ہوئے اس دُنیا میں تشریف لانا مشکوک ہو جائے گا۔ کیا جناب تھانوی صاحب اس کی وضاحت

فرما سکتے ہیں۔؟

ترکِ اولیٰ

الغرض حضرت آدمؑ و حوا علیہما السلام میاں بیوی کی حیثیت سے بہت خوش و خرم، سیرِ جنّت میں مصروف، کھانے پینے اور رہنے سہنے کے آرام کے ساتھ اپنا سفرِ زندگی طے کر رہے تھے کہ ایسے میں ابلیس یعنی شیطان کو ان پر بہت حسد ہوا۔ اور ان کو جنت سے نکلوانے کی ترکیبیں کرتا رہا۔ بہت سی ناکامیوں کے بعد آخر ایک چال کامیاب ہوگئی۔ اس نے ان دونوں سے خدا کی قسم کھا کر شجرِ ممنوعہ کو کھانے پر آمادہ کر لیا اور انہوں نے اس کی جھوٹی قسم پر اعتبار کر کے اس کے ذائقہ کو چکھ لیا۔ کیونکہ یہ دونوں یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ کوئی خدا کی جھوٹی قسم بھی کھا سکتا ہے۔ بہرحال وہیں آوازِ قدرت آئی کہ اے آدم کیا ہم نے تمہیں اس درخت کے قریب جانے کو منع نہیں کیا تھا۔ اب تمہیں لباسِ جنت سے محروم کیا جاتا ہے اور تمہاری اور اس ابلیس کی قرار گاہ زمین مقرر کی جاتی ہے۔ تمہیں اور ابلیس کو ایک دوسرے کا دشمن قرار دیا جاتا ہے۔ تم سب ایک وقتِ مقرر تک اسی زمین پر رہو گے۔ تمہاری اولادیں یہیں پیدا ہوں گی اور یہیں دفن ہوں گی۔

حضرت آدم و حضرت حوا علیہما السلام اس ترکِ اولیٰ پر پشیمان، فراقِ جنّت کے ساتھ دنیا میں بھی ایک دوسرے کی جدائی کا رنج اٹھاتے ہیں۔ اپنے برہنہ جسموں کو پتوں سے ڈھک کر بارگاہِ الٰہی میں گریہ و زاری میں مصروف ہوتے ہیں۔ برسوں کی گریہ و زاری کے بعد محمدؐ و آلِ محمدؑ کے واسطے سے ان کی توبہ قبول ہوتی ہے۔ ایک دوسرے سے ملاقات ہوتی ہے اور پھر سلسلۂ نسلِ انسانی شروع ہو جاتا ہے۔ یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ بعض مسلمان حضرت آدم علیہ السلام کے اس ترکِ اولیٰ کو خطا و گناہ سمجھتے ہیں اور اس کو بنیاد بنا کر وہ انبیاء کی عصمت کے منکر ہیں لیکن وہ شاید خدا کی حکمت سے ناواقف ہیں۔

سببِ خلقت

اُس حکیم علی الاطلاق یعنی خالقِ کائنات نے اپنی معرفت کے لئے محمدؐ و آلِ محمدؐ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو خلق کیا اور ان کی معرفت کے لئے تمام کائنات کی تخلیق کی۔ اس کائنات میں بے شمار عوالم پیدا کئے۔ ہر عالم کو عالمِ اسباب بنایا۔ ان عوالم میں مختلف النوع بے شمار مخلوق خلق کی۔ ہر نوعِ مخلوق کی ہر فرد کو ایک دوسرے

سے ممیز و ممتاز بنایا یعنی ہر نوع اگرچہ اپنی ساخت کے لحاظ سے ایک جیسی لیکن خد و خال اور طبائع کے لحاظ سے ہر فرد ایک دوسرے سے مختلف، صفات میں تضاد، صلاحیتِ کار میں امتیاز، جسمانی اور دماغی قوت میں فرق اور پھر جنس میں مختلف۔ ہر نوع مخلوق میں خواہ وہ جماد ہو کہ نبات، حیوان ہو کہ انسان، چرند ہو کہ پرند، آبی ہو کہ خاکی، نوری ہو کہ ناری، سب میں الگ الگ صلاحیتیں دی ہیں اور اُن میں سے بھی ہر فرد کو ایک دوسرے کا محتاج بنا دیا ہے۔ اُس نے موت کے لئے ایک بہانہ، رزق کے لئے حیلہ اور پیدائش کے لئے وسیلہ مقرّر کر دیا ہے۔ اگرچہ موت اُس کے حکم سے واقع ہوتی ہے لیکن بہانہ کوئی اور ہوتا ہے۔ مثلاً بخار سے مرا، ہیضہ ہو گیا، ایکسیڈینٹ یا ہارٹ فیل وغیرہ ہو گیا۔ ہر مخلوق کو رزق دینے کا وعدہ اسی کا ہے لیکن حیلہ کا نام ہوتا ہے۔ پیدائش اس کی طرف سے ہوتی ہے لیکن وسیلہ والدین کا ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام چونکہ زمین پر اللہ کے نائب بنا کر بھیجے جانے والے تھے لہٰذا شجرِ ممنوعہ اُن کے زمین پر آنے کا سبب ہوا اور اُن کی اولاد کے لئے یہ واقعہ ایک سبق بنا کہ اگر اولادِ آدمؑ سے خدا کی کوئی ایسی حکم عدولی ہو جائے جس کا تعلق ذاتِ پروردگار یعنی حقوق اللہ سے ہو تو وہ اگر اپنے ہوش و حواس کے قائم رہنے کے وقت تک خدا سے توبہ کرے گا تو اُس کو اُس کے باپ آدمؑ کی طرح معاف کر دیا جائے گا۔ البتہ حقوق العباد سے متعلق اللہ کی حکم عدولی وہی بندہ معاف کر سکتا ہے، جس کی حق تلفی ہوئی ہے۔ لیکن اگر وہ شیطان کی پیروی کرتے ہوئے اپنی ہٹ دھرمی پر اڑا رہا اور اُس نے حقوق اللہ کی عدم ادائیگی کی خدا سے اور حقوق العباد کی عدم ادائیگی کی اُس بندہ سے معافی نہ مانگی جس کی حق تلفی ہوئی ہے تو وہ روزِ محشر اپنا حشر خود دیکھ لیگا۔ کیونکہ اُس علیم و خبیر کے یہاں ہر ذرّہ خیر کا اور ہر ذرّہ شر کا پورا پورا حساب موجود ہوگا۔

نسلِ آدمؑ

حضرت آدم علیہ السلام کے تین بیٹے ہوئے، سب سے بڑا قابیل اُس سے چھوٹے ہابیل اور سب سے چھوٹے حضرت شیثؑ علیہ السلام تھے۔ قابیل بہ اغوار شیطان اکثر اپنے باپ کی نافرمانی کرتا رہتا تھا، اگر اس کو کوئی نصیحت کی جاتی تو وہ سرکشی پر آمادہ رہتا تھا، اس کے برعکس ہابیل اپنے والد کے مُطیع و فرمانبردار تھے۔ جب یہ دونوں سنِ بلوغ کو پہنچے تو اللہ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے ان دونوں کے لئے

بھی اُن کی شریکِ حیات کو پیدا کیا۔ قابیل کے لئے ایک بدخود بدسرشت بیوی اور ہابیل کے لئے نیک سیرت اور خوش مزاج بیوی، یعنی خبیث کے لئے ناپاک اور طیب کے لئے پاک بیوی کا انتظام کیا۔ ہابیل اپنی نیک بیوی کے ساتھ بہت خوش و خرم تھے لیکن قابیل کی زندگی اپنی بدطینت بیوی کے ہاتھوں حرام تھی کہ ایسے میں حضرت آدم علیہ السلام نے بحکمِ خدا حضرت ہابیل کو اپنا جانشین مقرر کرنے کا ارادہ فرمایا۔ قابیل کے لئے اِس بات نے جلتی پر تیل کا کام کیا، وہ اپنے باپ کا بڑا بیٹا ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو حضرت آدمؑ کی جانشینی کا مستحق سمجھتا تھا، چنانچہ اُس نے اِس امر میں اپنے باپ سے اختلاف کیا۔ باپ نے فیصلہ خدا پر چھوڑتے ہوئے دونوں کو اپنی اپنی قربانی خُدا کے حضور پیش کرنے کی ہدایت کی۔ دونوں نے اپنی اپنی قربانیاں خدا کے حضور پیش کیں۔ ہابیل کی قربانی قبول اور قابیل کی قربانی رد کر دی گئی۔ قابیل نے اس خدائی فیصلہ کو ماننے سے انکار کر دیا اور اس کا ثبوت اس نے اپنے بھائی ہابیل کو قتل کر کے دیا۔ لیکن بعد قتل پریشان کہ لاش کا کیا کرے۔ کئی روز تک لاش اٹھائے پھرا، آخر اللہ نے اُس کو کوؤں کے ذریعہ طریقِ دفن کی ہدایت کی۔ کچھ عرصہ بعد بیوہ ہابیل کا عقد حضرت آدم کے تیسرے اور چھوٹے بیٹے حضرت شیث علیہ السلام سے ہو گیا اور اِن دونوں سے چار لڑکے اور ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ اُدھر کچھ عرصہ بعد قابیل بھی عذابِ الٰہی سے ہلاک ہو گیا، اور اپنے پس ماندگان میں چار لڑکیاں اور ایک لڑکا چھوڑ گیا، چنانچہ ان دونوں بھائیوں کی اولادوں میں ایک دوسرے سے نکاح ہو کر سلسلۂ نسلِ آدم آگے بڑھا اور اس طرح حضرت آدم علیہ السلام کی زندگی میں ہی ان کے پوتے پوتیوں کی تعداد تقریباً ایک ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ حضرت شیثؑ حضرت آدم علیہ السلام کے جانشین ہوئے۔ اِن کی اولاد میں سلسلۂ انبیاء و صالحین چلا اور اولادِ قابیل میں زیادہ تر باغی اور سرکش انسان ہوئے۔ ایسے ہی سرکش انسانوں میں بعض قومیں اور قبائلِ عرب بعثتِ ختمی مرتبت تک قبولِ اسلام سے پہلے اپنی ماں بہنوں اور پھوپھیوں و خالاؤں وغیرہ سے نکاح کرنا جائز سمجھتے تھے اور بعض مذاہب میں تو اب تک ایسے

نکاح جائز سمجھے جاتے ہیں۔[۱]

حاکمیتِ مطلقہ

وہ حاکم مطلق اور قادر و قدیر اگر چاہتا تو شیطان کو اس کی سرکشی کی سزا میں شروع میں ہی ختم کر دیتا۔ لیکن وہ عادلِ حقیقی ہے۔ کسی کے ساتھ ظلم نہیں کرتا۔ اگر اس نے ایک طرف شیطان کو اُس کی عبادتوں کے صلہ میں ایک وقت معلوم تک انسانوں کو بہکانے کی چھوٹ دے دی تو دوسری طرف اس کے شر سے بچنے کے لئے اپنے ہادی اور معلم بھی بھیجے اور ساتھ ہی ساتھ در توبہ بھی باز رکھا کہ اگر انسان آخر وقت تک اُس کی حاکمیت تسلیم کر کے اس کے ہادیوں کی اطاعت کریں تو کچھ نجات کی امید ہو سکتی ہے۔ اِن خدا کے مقرر کئے ہوئے ہادیوں اور معلموں کو انبیاء و مرسلین اور ائمہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اِن ہادیانِ برحق کو اپنے خالق کی طرف سے کچھ مافوق الفطرت طاقتیں ملتی ہیں، جن کو وہ بغیر اس کی مرضی و بغیر اس کے حکم کے استعمال نہیں کرتے۔ عُرفِ عام میں اُن کو معجزہ کہا جاتا ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اپنے اِن بندوں

نظریۂ ڈارون

اس موقعہ پر ایک مغربی محقق اور مستشرق ڈارون کا نظریہ ارتقا بھی محلِ نظر ہے۔ اس کے نظریہ کے مطابق قانونِ ارتقا کی بدولت اگر انسان کی اصل بندر ہے تو پھر کیا اسی قانون کی رُو سے یہ نہیں ہو سکتا؟ کہ انسان کی پستی کی شکل بندر ہو؟ کیونکہ قانونِ ارتقا میں ترتیب صعودی اور ترتیبِ نزولی دونوں صورتیں ہوتی ہیں۔ یعنی بلندی کی طرف ارتقا اور پستی کی طرف نزول۔ قرآنِ مجید بنی اسرائیل کے بعض خاندانوں کو ان کی سرکشی کی وجہ سے "کونوا قِرَدَۃً خاسئین" کہہ کر انسان سے بندر بن جانے کی پوری نشاندھی کر رہا ہے۔ گویا از روئے قرآن احسن تقویم پر خلق ہونے والا یہ انسان اپنی تمرّد و سرکشی کی وجہ سے اسفل السافلین کی جانب جا رہا ہے۔ اگر ڈارون کی تھیوری کو مان لیا جائے گا تو پھر ہزاروں سال سے جو بندر دنیا میں موجود ہیں وہ کس وجہ سے انسان نہ بن سکے؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ڈارون صاحب کا سلسلۂ نسب کسی مسخ شدہ انسان یعنی بندر تک ملتا ہے۔ اور انہوں نے دم کٹی لومڑی کی طرح اپنا عیب ڈھکنے کے لئے تمام اولادِ آدمؑ کو بندر کی نسل سے کہہ کر اپنے قلب کو مطمئن کر لیا ہوگا۔

کے ذریعہ اپنے قادرِ مطلق ہونے کا اظہار کرتا ہے کہ اُسے کائنات کی ہر شے پر تصرف حاصل ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کا آگ میں ڈالا جانا اور اُس کا گلزار بن جانا بھی ایک معجزہ ہے۔ اُن کا کچھ پرندوں کو ذبح کرکے اور اُن کو قیمہ بنا کر، مختلف مقامات پر اس مخلوط قیمہ کو رکھ کر اُن کو آواز دے کر بُلانا، اور اُن کا از سرِ نو زندہ ہو کر اُن کے پاس آجانا بھی معجزہ ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جب نمرود سے دورانِ گفتگو آپ یہ فرماتے ہیں کہ میرا خدا مشرق سے سورج نکالتا ہے تو مغرب سے نکال دے تو وہ مبہوت ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر وہ پلٹ کر حضرت ابراہیمؑ سے یہ کہہ دیتا کہ اچھا میں تمہارے خدا پر ایمان لے آؤں گا اگر وہ مغرب سے آفتاب طلوع کر دے، تو ذرا انصاف کیجئے کہ اس وقت کیا ہوتا؟ کیا خدا اس پر قادر نہ تھا کہ وہ مغرب سے آفتاب طلوع کر دے؟

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا کا اژدھا بن جانا۔ دریائے نیل میں راستوں کا پیدا ہو جانا یعنی ماہئیت آب کا بدل جانا، کیا اللہ کے تصرف کائنات کا ثبوت نہیں ہے؟

حضرت صالحؑ سے جب ان کی قوم نے کہا کہ ہم تو تمہارے خدا پر اس وقت ایمان لائیں گے جب اس سامنے والے پہاڑ سے ایک اونٹنی برآمد ہو اور وہ ایک بچہ بھی جنے، تو اللہ نے بغیر کسی وسیلہ کے پہاڑ سے اونٹنی کو پیدا کرکے اور اس کو بچہ جنوا کر اپنے قادر و قدیر ہونے کا برملا اظہار کیا مگر قومِ صالحؑ نے حاکمیتِ الٰہی کو تسلیم کرنے کے بجائے ان شعائر اللہ یعنی اونٹنی اور اُس کے بچہ کو ہلاک کر دیا اور پھر اس سرکشی کی سزا میں عذابِ خدا کے مستحق ہو کر دنیا و آخرت دونوں سے محروم ہو گئے۔

حضرت سلیمانؑ کے وزیر اور وصی حضرت آصف بن برخیا کو اللہ نے علم کتاب سے کچھ تھوڑا سا علم دیا تھا، جس کی بدولت وہ تختِ بلقیس کو ملکِ سبا سے چشم زدن میں حضرت سلیمان کے دربار میں لے آئے تھے، تو پھر جس کو پورا علم کتاب ملا ہو اُس کے تصرف کائنات کا کیا عالم ہوگا؟

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بغیر باپ کے پیدا کرکے اُس نے اپنے قادرِ مطلق ہونے کا ثبوت دیا۔ انہوں نے گہوارہ میں کلام کرکے قوم بنی اسرائیل کو اپنے نبی اور صاحبِ کتاب ہونے کا یقین دلانا چاہا۔ جوان ہو کر مُردوں کو زندہ کرنے، اندھوں کو انکھیارہ بنانے اور مٹی سے جانور بنا کر اُن میں روح پھونک کر زندہ کرنے کے معجزات دکھا کر خدا کی حاکمیت تسلیم کرانے کی

کوشش کی لیکن ان باغی اور سرکش انسانوں نے خدا کی حاکمیت تسلیم کرنے کے بجائے خود حضرت عیسیٰؑ ہی کو اپنی دانست میں سولی پر لٹکا کر مار دیا۔ اگرچہ کہ خدا نے ان کو سولی پر سے اٹھا کر ایک وقت معلوم تک زندہ رکھا ہے۔ خود قوم عیسیٰؑ نے اُن کو خدا کا بیٹا سمجھ کر اُن کی ہی عبادت شروع کر دی۔!

حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت عیسیٰؑ تک جب انسانوں کی تمرد و سرکشی بڑھتی ہی گئی تو اللہ نے آخر میں کُل انسانوں کی ہدایت کے لئے اپنی اوّل مخلوق کو رحمت اللعالمین بنا کر پردۂ دنیا پر بھیجا۔ مگر سرکش انسانوں نے اس رحمتِ مجسّم کی بھی مخالفت کی، اور اس سے معجزے طلب کئے! اُس نے سنگریزوں کو قوتِ گویائی دے کر، چاند کو دو ٹکڑے کرکے، سورج کو بعد غروب مغرب سے پلٹا کر، خدا کے تصرف کائنات کا اظہار کیا۔ اور سب سے بڑا معجزہ قرآن پیش کرکے انسان کو حاکمیتِ الٰہی بلاجبر و اکراہ قبول کرنے پر آمادہ کیا۔

اگرچہ قرآنِ مجید میں تمام انبیاء کی فہرست نہیں ملتی، لیکن عام خیال کے مطابق اللہ نے انسانوں کی ہدایت کے لئے ایک لاکھ چوبیس ہزار ہادی بھیجے اور سورۂ رعد کی آیت ۷ کے ذریعہ یہ کلیہ بیان کر دیا کہ ہر قوم کے لئے ایک ہادی ہے۔ اُس نے ان سب ہادیوں کے بھیجنے کا مقصد سورۂ حدید کی آیت ۲۵ میں اس طرح بیان کیا۔ ٥ لقد ارسلنا .... قوی عزیزہ

ترجمہ:۔ ہم نے (اللہ نے) اپنے رسولوں کو واضح اور روشن نشانیوں کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب و میزان بھی نازل کیں تاکہ انسان عدل پر قیام کریں اور ہم نے لوہا نازل کیا جس میں سخت کاٹ ہے اور انسانوں کے لئے فائدے ہیں تاکہ اللہ اس شخص کو جان لے (پہچنوا دے) جو اُس (اللہ) کی اور اس کے رسولوں کی پوشیدہ طور سے مدد کرتا رہا ہے۔ بے شک خدا بڑا زبردست غالب ہے۔

تشریح:۔ مندرجہ بالا آیت کی رُو سے انسانوں کے لئے جو نظامِ حیات عدل کی بنیاد پر قائم ہوگا تو اس میں امن و سلامتی ہوگی اور فتنہ و فساد نہ ہوگا کہ یہی اصل منشائے خالق کائنات ہے اور اس کے لئے اپنے رسولوں کو نمونہ بنا کر بھیجنے کے ساتھ ایسے انسان کو بھی پہچنوایا ہے جس نے شروع سے ہی اللہ اور اس کے رسولوں کی مدد کی اور اب اس آخری رسول کی مدد ظاہر بظاہر کر رہا ہے۔

حاکمیت سے انکار

مگر انسانی تاریخ اور قرآنِ مجید کے ذریعہ یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انسانوں کی اکثریت نے حاکمیتِ الٰہی کو تسلیم نہیں کیا۔ اُس کے مقرر کردہ ہادیوں

کا مذاق اڑایا۔ اُنہیں ساحر و مجنون کا خطاب دیا۔ اُن میں سے بعض نے خدا کے وجود کو ہی تسلیم نہیں کیا اور جنہوں نے خدا کے وجود کو مانا بھی تو پھر انبیاء و رسولوں کی تعلیم کے برعکس اس کو مجسم مان کر اور اس کے بُت بنا کر اُس کی پوجا شروع کر دی۔ بعض نے انسانوں ہی کو خدا سمجھ لیا۔ بعض نے سورج چاند ستاروں کو خدا مانا۔ بعض نے بہت سے خداؤں کو اپنے معتقدات میں شامل کیا۔ بعض نے خدا کے بیوی بچّے ہونے کا تصوّر قائم کیا۔ بعض نے آگ کی پوجا شروع کر دی۔ بعض نے دیوی دیوتاؤں کو اپنا کارساز خیال کیا۔ بعض نے مختلف جانوروں کو خدا کا اوتار سمجھا۔ بعض لوگ راجوں مہاراجوں، بادشاہوں اور شہنشاہوں کو اَن داتا خیال کر کے اُن کے سامنے ہاتھ جوڑ کر سجدہ ریز ہوئے۔ بعض نے ان ہادیانِ برحق کے ہی مجسّمے بنا کر اُن کی پرستش شروع کر دی۔ غرض کہ جو انسان اشرف المخلوقات بنا کر بھیجا گیا تھا۔ اُس نے بہ اغوائے شیطان اپنی عزتِ نفس کو اتنا مجروح کیا کہ وہ ارذل المخلوقات کہے جانے کا مستحق ہو گیا!

تبلیغِ رسالت

بہرحال جب دُنیا میں چاروں طرف جہل و ظلم کی تاریکی چھانے لگی تو ختم المرسلین رحمت اللعالمین نے خُلق مجسّم ہو کر انسانوں کی ہدایت کا فریضہ بہ طریقِ احسن انجام دیا۔ اور اپنے خُلقِ عظیم کا ایسا مظاہرہ کیا کہ دشمن بھی اعتراف کئے بغیر نہ رہے۔ آپ نے انسانوں کو اُن کی انفرادی اور اجتماعی زندگی بسر کرنے کا ایسا منشور دیا جو ہر زمانہ اور ہر دور میں مشعلِ راہ ہے۔ آپ نے قرآن کی صورت میں ایک ایسا ضابطۂ حیات قیامت تک کے لئے دے دیا جس میں وہ سب کچھ موجود ہے جس کی انسانوں کو قیامت تک ضرورت ہو گی۔ آپ نے رنگ و نسل، قوم و وطن اور خاندانی افتخار کے بتوں کو اپنے قول و عمل سے ہمیشہ کے لئے پاش پاش کر دیا۔ آپ نے تمام انسانوں کو صرف ایک خدائے واحد کی پرستش کرنے کی تبلیغ کی۔ آپ نے انسانوں کو اپنے سامنے جھکوانے یا اُن پر حکمرانی کرنے کا تصوّر تک نہ کیا۔ آپ نے جو احکامِ خدا بندوں تک پہنچائے اُن کا لُبِّ لُباب، امن و سلامتی اور انسان کی عزتِ نفس کو بلند کرنا تھا۔ لیکن انسانوں کی اکثریت نے انبیائے ماسبق کی طرح آپ کو بھی جھٹلایا۔ اپنے کفر و شرک پر قائم رہے۔ اور جنہوں نے بہ تقاضائے مصلحت، ظاہری طور پر آپ کے پیغام کو قبول کر کے، اسلام اختیار بھی کر لیا تو انہوں نے بھی اُممِ سالقہ کی طرح خدا کی معرفت آپ کی تعلیم کے مطابق حاصل نہ کی۔ اگرچہ انہوں نے اور

اُمتوں کی طرح بُت پرستی تو نہ کی لیکن اپنے تصوّر میں خدا کی خیالی تصویریں بنا کر اور اس کو اپنی مرضی کے مطابق چلا کر اُس کی پرستش شروع کر دی۔ پہلی اُمتوں کی طرح اُمّت مسلمہ میں بھی سینکڑوں فرقے وجود میں آ گئے۔

تفرقہ

اللہ نے اپنے جن بندوں کو اپنے قرآن اور اپنے رسول کے ذریعہ، بعد رسول انسانوں کا ہادی مقرر کیا تھا، اُمت مسلمہ کی اکثریت نے ان سے رُوگردانی کر کے اپنے ہادی خود مقرر کرنا شروع کر دیئے۔ اگرچہ حیات رسول میں ہی صحابہ کرام میں دو گروہ ہو چکے تھے لیکن بعدِ رحلتِ رسول اس امت کی اکثریت نے منصب ہدایت پر اپنے طور پر ایسے افراد کو منتخب کیا جو حکمران تو کہے جا سکتے ہیں لیکن وارث علم کتاب نبوی نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ انسانوں کی ہدایت کا فریضہ خود انجام نہ دے سکے۔ انہوں نے مجبوراً اور بہ تقاضائے مصلحت وارثانِ علم کتاب کو چھوڑ کر امور شریعت کی نگرانی کے لئے کچھ افراد پر مشتمل ایک مجلس مقننہ قائم کی جس کے سربراہ زید بن ثابت مقرر ہوئے۔ اس کمیٹی نے اصولی طور سے تو اسلام میں زیادہ فرق نہیں کیا لیکن فروعی طور سے ارکان اسلام کی ادائیگی کا طریقہ اپنی مرضی سے طے کیا جو آل محمدؐ سے ہٹ کر تھا۔ جوں جوں وقت گزرتا رہا ان دونوں گروہوں میں بہت سی شاخیں نکلتی رہیں اور ان میں فروعی اختلافات اور زیادہ پیدا ہوتے رہے۔ مثلاً ارکانِ اسلام میں ایک رکن نماز ہے۔ اس کا بنیادی اصول تو سب کا ایک ہی ہے جیسے فجر، ظہر، عصر، مغرب اور عشاء کی فرض رکعات کی تعداد سب کے یہاں یکساں طور سے سترہ ہے۔ اوقاتِ نماز بھی سب کے یہاں یکساں ہیں۔ قیام و رکوع و سجود بھی ایک ہی طرح ہیں، لیکن اگر اختلاف ہے تو طریقۂ ادائیگی میں۔ کوئی ہاتھ باندھتا ہے۔ کوئی ہاتھ کھولتا ہے۔ کوئی رفع یدین کرتا ہے۔ کوئی بعد تلاوتِ سورۂ حمد آمین بالجہر کہتا ہے۔ کوئی آمین بالخفی اور کوئی الحمد للہ رب العالمین کہتا ہے۔ غرض کہ مختلف فرقہ ہائے اسلامی میں مختلف طریقے ادائیگی نماز کے ہیں۔ لیکن ایک بات ہر فرقہ میں مشترک ہے۔ اور وہ یہ کہ دوران نماز محمدؐ و آلِ محمدؐ پر درود بھیجنا کہ اس کے بغیر کسی شخص کی نماز درجہ قبولیت پر نہیں پہنچتی! بڑی حیرت اس بات پر ہے کہ نماز میں جو خالص اللہ کی بندگی کے لئے ہے تو محمدؐ و آل محمدؐ کا ذکر لازمی ہے لیکن عام زندگی میں مسلمان اُن سے نافر ہیں۔ اور اُن کے ذکر سے نالاں! ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر اُن پر الزام تراشیاں ہوتی ہیں اُن کو خطا کار، گنہ گار، باغی اور نفس پرور وغیرہ ثابت کرنے کے لئے پورا زور صرف کیا جاتا ہے۔ کیا

کوئی مسلمان اس کی وجہ بتا سکتا ہے۔؟

ارکان اسلام کا دوسرا رکن روزہ ہے۔ تمام ملتِ مسلمہ میں رمضان کے پورے ماہ کے روزے واجب ہیں بغیر کسی عذر شرعی کے کوئی مسلمان اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن اوقات کے تعین میں اختلاف ہے۔ اور اسی طرح دیگر تمام امور میں فروعی اختلاف نظر آتے ہیں۔ امت مسلمہ جس کے لئے سورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۰۳ میں خدا کا حکم ہے کہ واعتصموا بحبل اللّٰہ جمیعا ولا تفرقوا۔ وہی امت مسلمہ فرقے فرقے ہو کر اور آپس میں لڑ جھگڑ کر اس قدر کمزور ہو گئی ہے کہ اُسے اب اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لئے بھی بہت مشکل کا سامنا ہے۔!

مسلمانوں کا ہر فرقہ ہم چنیں دیگرے نیست کے مصداق اسلام کا علمبردار اور ٹھیکیدار بنا ہوا ہے۔ اپنے نجات یافتہ اور جنتی ہونے کے گمان میں اپنے علاوہ ہر دوسرے فرقہ کو کافر و مشرک اور بدعتی سمجھتا ہے۔ ان میں کوئی جعفری ہے کوئی حنفی و مالکی و حنبلی و شافعی، کوئی اشعری ہے تو کوئی معتزلہ۔ کوئی سنی ہے تو کوئی شیعہ۔ کوئی آغا خانی ہے تو کوئی بوہری، کوئی بریلوی ہے تو کوئی دیوبندی، کوئی اہلِ قرآن ہے تو کوئی اہلِ حدیث، کوئی اپنے آپ کو احمدی کہتا ہے تو کوئی حزب اللہ۔ غرض کہ ہر فرقہ ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہے۔ (ان میں سے ایک فرقہ احمدی کو جس کو عرف عام میں قادیانی کہا جاتا ہے حکومت پاکستان نے سرکاری طور سے غیر مسلم قرار دے دیا ہے اور صرف اس بنیاد پر کہ یہ فرقہ ختم نبوت کا قائل نہیں ہے۔ اس فرقہ کے بانی کو بقول اُن کے اللہ نے خواب میں آکر نبوت عطا کر دی تھی۔! ان کے سارے عقائد کا دارومدار خواب و خیال پر ہی مبنی ہے۔ حقیقت سے دور کا بھی لگاؤ نہیں ہے)

مسلمانوں کے اور بہت سے فرقے بھی جو ختم نبوت پر تو یقین رکھتے ہیں لیکن خدا کے مجسّم ہونے اس کے نقلِ مکانی کرنے، خواب میں نظر آنے اور آخرت میں اس کے دیدار کے قائل نظر آتے ہیں۔

بہر حال تمام اولادِ آدمؑ اور خاص طور سے مسلمانوں میں اتنے فرقے اور اُن کے مختلف عقائد و نظریات صرف اس وجہ سے پیدا ہوئے کہ انہوں نے حاکمیتِ الٰہی کو تسلیم نہ کر کے اللہ کے مقرر کردہ ہادیوں کی اطاعت و پیروی نہ کی۔ اپنے اقتدار اور حکمرانی کی ہوس میں انہوں نے ان احکاماتِ الٰہی کو بالکل فراموش کر دیا جو حاکمیتِ الٰہی کے قیام کے لئے لازمی ہیں۔ قرآن کریم میں اللہ نے حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت خاتمؐ تک کے زمانے کے انسانوں کا ذکر کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ انسانوں کی اکثریت

نے ان نمائندگانِ الٰہی کی حکم عدولی کی۔ اس نے ابتدائے خلقت انسان سے قیامت تک کے انسانوں کے لئے یہ اصول مقرر کر دیا کہ جو انسان اس کے نمائندوں سے انحراف کریں گے وہ گھاٹے میں رہیں گے۔ اس نے جنت کی بشارت کسی قوم، کسی مذہب، کسی فرقہ یا کسی خاندان کو نہیں دی بلکہ اس نے اس کا معیار تقویٰ قرار دیا۔ سورہ حجرات آیت ۱۳ میں ارشاد باری تعالیٰ ہوا یا ایھا الناس ---- علیم خبیر۔

ترجمہ:۔ اے گروہ انسان ہم نے تمہیں مرد و عورت سے پیدا کیا اور تمہارے خاندان اور قبیلے اس لئے بنا دیئے کہ تم پہچانے جاؤ۔ بہ تحقیق اللہ کے نزدیک تم میں (سب سے) مکرم وہ ہے جو (سب سے زیادہ) صاحبِ تقویٰ ہے بے شک اللہ علیم و خبیر ہے۔

تشریح:۔ اگرچہ اللہ نے دنیا کے تمام انسانوں کو مختلف قوموں، خاندانوں اور قبیلوں میں تقسیم کر دیا ہے لیکن اللہ کے نزدیک ان تمام انسانوں میں وہ انسان ہی پسندیدہ ہیں جو صاحبانِ تقویٰ ہیں۔ اور تقویٰ کی مختصر تعریف یہ ہے کہ "اوامر و نواہیٔ خدا کی تعمیل بلا جبر و اکراہ" اب ہر انسان اور خاص طور پر ہر مسلمان، قرآن کے سورۂ الحمد سے لے کر سورۂ والناس تک آیاتِ قرآن کے آئینہ میں اپنی تمام صفات، عقائد اور اعمال کو دیکھ لے اور خود ہی فیصلہ کر لے۔ اللہ نے سورۂ واقعہ میں کل انسانوں کو صرف تین گروہوں میں تقسیم کیا ہے۔ (۱) السابقون السابقون (۲) اصحاب یمین (۳) اصحابِ الشمال۔ انفرادی طور سے ہر انسان مندرجہ بالا ان تین گروہوں میں سے ایک میں ضرور ہوگا۔

منصبِ ہدایت

جس طرح انبیاء ماسبق کی امتوں کی اکثریت نے اُن انبیاء اور ان کے اوصیاء کو، دل سے نمائندۂ الٰہی نہیں مانا۔ اسی طرح ختمی مرتبت کی امت نے بھی ان کے اوصیاء کو نمائندہ الٰہی نہیں مانا۔ حالانکہ خود ختمی مرتبت نے اللہ کے حکم سے اُس کی سنت کے تحت اپنے جانشینوں کا تقرر کیا تھا اور مختلف طریقوں سے متعدد بار ان جانشینوں کا تعارف کرایا تھا اور اس سلسلہ میں بہت زیادہ آیات قرآنی اور احادیث نبوی موجود ہیں۔ بخوفِ طوالت صرف چند احادیث پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

حضورؐ نے فرمایا کہ میرے بعد میرے بارہ جانشین ہوں گے، جو قریش سے ہوں گے۔ اسی حدیث کو بنیاد بنا کر، سقیفہ بنی ساعدہ میں، مہاجرین نے انصار پر اپنی فضیلت ظاہر کر کے خلافت حاصل کر لی تھی۔

اور جب حضرت علیؑ نے اسی دلیل پر اپنا استحقاق پیش کیا تو وہ رد کر دیا گیا۔

ایک اور حدیث میں حضرت جابر ابنِ عبداللہ سے مروی ہے کہ حضورؐ نے اپنے بارہ جانشینوں کے نام تبلاتے ہوئے فرمایا کہ اِن میں اوّل بھی محمدؐ ہے اوسط بھی محمدؐ ہے اور آخر بھی محمدؐ ہے، بلکہ کل کے کل محمدؐ ہیں۔ اور اے جابر جب تم میرے پانچویں فرزند سے جس کا نام بھی محمدؐ ہو گا ملاقات کرو تو اُن سے میرا سلام کہنا۔ اپنے بارہویں جانشین کے بارے میں فرمایا کہ وہ بالکل میری ہی طرح ہو گا۔ اس پر حضرت جابر نے گھبرا کر کہا کہ یا رسول اللہ وہ آپ ہی تو نہ ہوں گے تو حضورؐ نے خاموشی اختیار کر لی۔

مندرجہ بالا حدیث سے ایک بات یہ بھی ثابت ہوتی ہے کہ حضورؐ کو علمِ غیب تھا کیونکہ کوئی شخص جب اپنی یا کسی کی موت کے وقت سے باخبر نہیں ہوتا تو حضورؐ نے جابر کے بارے میں یہ کیونکر کہہ دیا کہ تم میرے پانچویں جانشین سے ملاقات کرو گے؟ یہاں اس موقعہ پر میں جناب مولوی عبدالشکور نجمؔ کے بھتیجے عبدالودود شمسؔ لکھنوی کا ایک قطعہ ہدیۂ ناظرین کر رہا ہوں جو مندرجہ بالا حدیث کی صحیح ترجمانی ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔

امام جتنے ہیں ان سب کا ایک ہی ہے خمیر
ہیں ان میں سب ہی محمدؐ صغیر ہوں کہ کبیر
عجب نہیں کہ نظر بندئ مصوّر نے
اُلٹ پلٹ کے دکھائی ہو ایک ہی تصویر

ایک اور حدیث میں حضورؐ نے اپنے دونوں شہزادوں کو امامین اور جوانانِ جنت کے سردار اور ان کے والد کو ان سے افضل بتا کر اُمتِ مسلمہ کو ان کی پیروی کرنے کی ترغیب دی۔

ایک تاریخی واقعہ خم غدیر میں اپنے ان بارہ جانشینوں کے سرخیل حضرت علیؑ کو بحکم خدا اپنا جانشین بنا کر اور "من کنتُ مولاہُ فھذا علی مولا" کہہ کر پوری اُمتِ مسلمہ کے لئے اپنی طرح ان کی بھی اطاعت فرض قرار دے دی مگر اُمتِ مسلمہ نے لفظ مولا کی تاویل کر کے اس اطاعت سے انحراف کیا۔ اس موقعہ پر ایک شاعر کی یہ دلیل بھی کیا خوب ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔

عبث در معنئ من کنت مولا می روی ہر سو
علیؑ مولا بہ ایں معنی کہ پیغمبر بود مولا

حضورؐ نے اپنے بعد قیامت تک آنے والے مسلمانوں اور خاص طور سے اپنی نسل سے

ہونے والی اولاد جو آپ کی صاحبزادی حضرت فاطمہ زہرا و علی مرتضیٰ سے ہوگی مُراد لے کر فرمایا۔ میرے اہلبیت کی مثال کشتیٔ نوح کی طرح ہے جو اس میں بیٹھ گیا نجات پا گیا جو اس سے علیحدہ رہا غرق ہوا۔

اس معنی خیز حدیث سے حضورِ ختمی مرتبت کی بصیرت کا پتہ چلتا ہے کہ آپ نے اپنی خداداد بصیرت سے یہ دیکھ لیا ہوگا کہ پیغمبر نوحؑ کی طرح اپنی ہی اولادیں سے بہت سے ایسے ہوں گے جو اپنے آپ کو آلِ رسولؐ کی نسبت سے سیّد[1] کہہ کر اپنے ہی آباء و اجداد یعنی اہلبیت کو نہ صرف یہ کہ نا قابلِ اطاعت و پیروی سمجھیں گے بلکہ ان کے مخالفوں، معاویہ و یزید، المنصور و ہارون الرشید اور متوکّل وغیرہ اور اُن کے پروردہ علماء، ابنِ تیمیہ، فضل ابنِ روزبہان، کسائی، محمد اسمٰعیل بخاری، سبطِ ابن جوزی اور ابنِ حجر مکّی وغیرہ اور اِن سے متأثر شبلی نعمانی، عبدالحلیم شرر، مرزا حیرت دہلوی اور محمود احمد عباسی وغیرہ وغیرہ کے ہمنوا ہو کے توہینِ رسولؐ و اہلبیتِ رسولؐ کے مرتکب ہو کر غرقِ دریائے ضلالت ہوں گے۔

بصیرتِ رسولؐ نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ اُن کی اولادیں سے ایسے بھی ہوں گے جو اصولاً اور قولاً تو اہلبیت کو اپنا ہادی سمجھیں گے لیکن اپنے عمل سے اپنے قول کی تکذیب کرنے والے ہوں گے۔ اور مواخذۂ الٰہی کے مستحق ہو کر اپنے اعمال کے جوابدہ ہوں گے۔

---

[1] شیعہ اثنا عشری عقائد و نظریات کے خلاف کسی بھی عقیدہ اور نظریہ کا حامل جو اپنے نام کے ساتھ سیّد لکھتا ہے یا کہلواتا ہے اگر وہ اپنے کسی ذاتی شرف کی وجہ سے ایسا کرتا ہے تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن اگر وہ آلِ رسولؐ کی نسبت سے کہتا ہے تو یہ سیادت ہر لحاظ سے اس کے لئے باعث تضحیک و تذلیل ہوگی نہ کہ باعثِ افتخار و توقیر۔ کیونکہ اگر اُس کے عقیدہ اور نظریہ کے مطابق اُس کے آباء و اجداد بُرے اور نا قابلِ اطاعت و پیروی تھے تو پھر اُن سے اپنے آپ کو نسبت دینا کس طرح باعثِ فخر ہوگا۔ اور اگر اُن کے آباء و اجداد یعنی اہلبیتِ رسولؐ اچھے اور قابلِ پیروی تھے تو پھر اُن کے مخالفین کی اطاعت و پیروی میں اُن کو بُرا کہنا اور بُرا سمجھنا سوائے ناخلف اولاد کے اور کون کر سکتا ہے لہذا اہلِ عقل و خرد کے نزدیک اُن کا اپنے آپ کو سیّد کہنا خود اُن کے لئے باعثِ توہین و تضحیک و تذلیل ہوگا۔ اور اس کا فیصلہ خود وہ شخص بھی اپنے آپ کر سکتا ہے کسی سے کہنے سننے یا پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

ختمی مرتبت یہ بھی جانتے ہوں گے کہ اُن کی اُمّت سے اُن کی عیز اولاد خود اُن کی اور اُن کے اہلبیت کی اتباع کر کے نہ صرف نجات پائے گی بلکہ کمالِ اتباع کی بدولت حضرت سلمان فارسی کی طرح شاملِ اہلبیت بھی ہو جائے گی۔ علمِ رسولؐ میں یقیناً یہ بھی ہو گا کہ حضرت نوح علیہ السلام کی بیوی کی طرح اُن کی بھی بعض ازواج سفینۂ اہلبیت میں سوار ہونے سے انکار کر دیں گی اور خدا کو سورۂ تحریم میں اُن کی نشاندہی کرنا پڑے گی۔

سرور کائنات نے طرح طرح سے اور متواتر اس پیغام خدا کو پہنچانے کی سعی بلیغ کی اور آخر کار اپنے وقتِ رحلت اُمّت مُسلمہ کو قیامت تک گمراہی اور ضلالت سے بچانے کے لئے ایک اور آخری کوشش کی اور یہ مشہور حدیث ارشاد فرمائی۔ "انی تارک فیکم الثقلین ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ علی الالحوض"۔

ترجمہ:۔ "میں تم میں (اُمّت میں) دو گراں قدر چیزیں چھوڑے جاتا ہوں۔ ایک کتاب خدا دوسری میرے اہلبیت جو میری عترت سے ہوں گے، اگر تم اِن دونوں سے متمسک رہو گے تو میرے بعد ہرگز گمراہ نہ ہو گے اور یہ دونوں یعنی قرآن اور اہلبیت حوضِ کوثر پر وارد ہونے تک ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے"۔

اس کے بعد آپ نے اپنی عیادت کرنے والے تمام حاضرین سے جن میں عزیزانِ رسولؐ اور صحابۂ کرام سب ہی تھے فرمایا "کاغذ اور قلم لاؤ تاکہ میں تحریری طور پر بھی اپنی وصیت لکھ دوں"۔ عزیزانِ رسولؐ نے حکم رسولؐ کو بجالانا چاہا جس پر حضرت عمر نے فرمایا کہ اس وقت رسول اللہ شدّتِ مرض میں ہذیانی کیفیت میں مبتلا ہیں اور ممکن ہے کہ تحریری وصیت نامہ خلافِ اسلام ہو جائے لہذا ہمیں اللہ کی کتاب کافی ہے۔ بہ الفاظ دیگر ہمیں نہ تو اس وصیت نامہ کی ضرورت ہے اور نہ اہلبیت کی۔ اس بات پر حاضرین میں نزاع ہوا کہ کاغذ و قلم دیا جائے یا نہ دیا جائے۔ حکمِ رسولؐ کی مخالفت کرنے والوں کی آوازیں جب زیادہ بلند ہوئیں تو حضور سرور کائنات نے اپنے منصبِ نبوت کی عظمت سورہ حجرات کی آیت ۲ میں لا ترفعوآ اصواتکم فوق صوت النبی کا محل و مقام جتانے اور بتانے کے لئے اُن تمام شور کرنے والوں کو اپنے پاس سے اُٹھ جانے کا حکم دے دیا۔ حضرت علیؑ کو اپنے پاس رکھا کچھ راز و نیاز کی باتیں کیں اور اپنی بیٹی اور شہزادوں کو بلایا۔ اُنھیں پیار کیا۔ بیٹی سے باتیں ہوئیں پہلے تو وہ روئیں پھر مسکرائیں۔ چونکہ حضورؐ کی رحلت

اُم المومنین حضرت عائشہ کے حُجرہ میں ہوئی تھی اور وہ خود بھی اس وقت وہاں موجود تھیں لہذا وہ ان سب باتوں کی عینی راوی ہیں۔ لیکن مسلمانوں نے اس حدیث کو بھی بے اثر بنانے کے لئے اس کو کئی طرح سے بیان کرنا شروع کر دیا۔ کبھی قرآن کے ساتھ خلیفتین کا جوڑ ملایا اور کبھی قرآن کے ساتھ سنت کو بتایا مگر اس پر بھی دو گرانقدر چیزوں کا اقرار رہا۔ مگر حیف کہ آج کے دور میں بجائے دو چیزیں چھوڑنے کے صرف ایک بھاری چیز قرآن ہی چھوڑنے کو بتا کر نئی نسل کو گمراہ کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ مصنف تاریخِ اسلام سیّد عین الحق صاحب اپنی کتاب میں خطبہ حجۃ الوداع کو تحریر کرتے ہوئے صفحہ ۶۸ پر لکھتے ہیں کہ "میں تم میں ایک چیز چھوڑتا ہوں اگر تم نے اُسے مضبوط پکڑ لیا تو گمراہ نہ ہو گے وہ چیز کیا ہے اللہ کی کتاب"۔

سید عین الحق صاحب آپ نے حضرت عمرؓ کے قول حسبنا کتاب اللہ کو صحیح ثابت کرنے کے لئے فرمانِ رسولؐ کے دوسرے جزو اہلبیت کو خطبہ سے خارج کر کے، اور اسی خطبۂ آخری میں سے حضرت علیؑ کی جانشینی کا واقعہ جو تمام کتبِ تواریخ میں موجود ہے حذف کر کے تلبیس حق و باطل اور کتمانِ حق کی جو جرأت کی ہے وہ آپ ہی جیسے سیّدوں کے لئے زیبا ہے اور اس کا اجر آپ کو اور آپ کے ہم خیالوں کو خالقِ کائنات ہی دے گا لیکن ہم تو جب جانیں کہ آپ قرآن میں سے سورۂ آلِ عمران کی آیات ۷ و ۸ و ۹ کو تحریف کر کے نکال دیں۔ ہو الذی - - - - - - - - لا یخلف المیعاد ہ

ترجمہ: "(اے رسول) خدا نے تجھ پر جو کتاب نازل کی ہے اُس میں ایک تو آیات محکمات ہیں، جو کتاب کی جان ہیں ——— اور دوسری قسم متشابہات ہیں۔ پس جن لوگوں کے دلوں میں کھوٹ (بیماری) ہے وہ متشابہ آیات کی پیروی کرتے ہیں اور صرف اس لئے کہ فتنہ برپا کریں۔ وہ اِن آیات کا مطلب منشائے خدا کے مطابق سمجھنا ہی نہیں چاہتے، حالانکہ ان آیات (متشابہات) کی تاویل سوائے خدا اور راسخون فی العلم کے کوئی نہیں جانتا۔ اور یہ (راسخون فی العلم) کہتے ہیں کہ یہ سب (آیاتِ قرآن محکم و متشابہ) ہمارے رب کی طرف سے ہیں اور ہم ان سب پر ایمان رکھتے ہیں مگر ان سے صاحبانِ عقل ہی نصیحت حاصل کرتے ہیں۔ اے ہمارے رب تو ہمارے ہدایت یافتہ ہو جانے کے بعد ہمارے دلوں کو زیغ (کھوٹ) سے بچانا اور اپنی بارگاہ سے رحمت عطا کرنا کہ تو بڑا دینے والا ہے۔

اے ہمارے رب تو ایک دن تمام انسانوں کو اکٹھا کرنے والا ہے اور بے شک تو اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔"

اللہ نے اپنے رسولؐ کی حدیث کی تصدیق کے لئے علم قرآن حاصل کرنے کے لئے راسخون فی العلم کی قید لگا دی۔ لہذا قرآن اسی شخص کو کافی ہو سکتا ہے جو راسخون فی العلم کی منزل پر ہو لیکن اس کے علاوہ جو کوئی بھی اپنے لئے حسبنا کتاب اللہ کہے، وہ اس قولِ خدا کے مطابق ایک غلط دعویٰ کا مدعی ہوگا۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ قرآنِ مجید کا دعویٰ ہے کہ دنیا کی کوئی تر اور خشک چیز ایسی نہیں جو اس کتاب میں نہ ہو۔ اور یہ کہ اُس کا بیان اس میں نہ کر دیا گیا ہو۔ تو اب صرف قرآن کو کافی سمجھنے والوں سے خواہ وہ کرۂ ارض کے کسی خطہ میں ہوں ارکانِ اسلام کے دو اہم رکن نماز اور روزہ کے بارے میں چند سوالات کے جواب مطلوب ہیں۔ بلا استثنار کوئی بھی عالمِ قرآن یا مفسرِ قرآن انفرادی طور سے یا اجتماعی طور سے ان سوالوں کے جوابات دے سکتا ہے یا دے سکتے ہیں۔

سوال ۱:۔ اگر اسلام پورے کرۂ ارض کے لئے ہے تو پھر قطبین پر جہاں انسانی آبادی کا وجود ثابت ہو چکا ہے، اگر وہ آبادی کسی تبلیغ کے ذریعہ اسلام قبول کرے تو پھر وہاں نماز اور روزے کے اوقات کا تعین کس طرح کیا جائے گا، یا وہاں کے لئے کیا احکام ہوں گے۔؟

سوال ۲:۔ کیا نص قرآن کی موجودگی میں کسی ایک شخص کو یا دنیا کے تمام مسلمانوں کو مل کر بھی یہ اختیار ہے کہ وہ خدا کے حکم کے معاملہ میں اپنے اجتہاد یا قیاس سے کوئی حکم نافذ کردیں؟

سوال ۳:۔ اگر قرآن کا یہ دعویٰ کہ اس میں ہر شے کا بیان ہے سچا ہے اور یقیناً سچا ہے تو پھر نص قرآن سے وہاں کے مسلمانوں کے لئے نماز، روزے کے احکام ثابت کیجئے؟

جواب کا انتظار رہے گا۔

ہادیانِ برحق

ناظرین کرام، سابقہ اوراق میں بعد رحلتِ ختمی مرتبت جانشینیٔ رسولؐ کے بارے میں آپ مسلمانوں کے نزاعی معاملات ملاحظہ کر چکے ہیں جن کا لُبِ لُباب یہ ہے کہ ایک گروہ نے اپنا ہادی خود مقرر کر لیا اور ایک گروہ نے حکمِ خدا و رسولؐ کے مطابق بعدِ رسولؐ اپنا ہادی اور امام اُسے مانا جو اللہ کی جانب سے رسول مقبول نے مقرر کیا تھا۔ اور اس طرح اس دوسرے گروہ کے عقیدہ کے مطابق حضرت علی علیہ السلام ائمہ اہلبیت سے پہلے

امام اور خلیفۂ رسولؐ بلا فصل قرار پائے۔

ائمۂ اہلبیت

امام علیؑ ابنِ ابی طالب

ائمہ اہلبیت سے پہلے امام تھے۔ آپ کا اسم گرامی علیؑ، کنیت ابو الحسن لقب ابو تراب، حیدر، اسد اللہ ہے۔ آپ کے والد ماجد کا نام عمران اور کنیت ابو طالب ہے اور اسی کنیت سے آپ زیادہ مشہور ہیں۔ آپ کی والدہ ماجدہ حضرت فاطمہ بنتِ اسد خاندانِ بنی ہاشم سے تھیں اور آپ نے رسولِ مقبول کو ماں کی طرح پرورش کرنے کا شرف پایا تھا۔

حضرت علیؑ کی ولادت ۳۰ سنہ عام الفیل میں خاص خانۂ کعبہ کے اندر ہوئی۔ حضرت آدمؑ سے لے کر آج تک کسی اور انسان کو یہ شرف نہیں ملا۔ خدا نے اپنی قدرت کا کرشمہ دکھانے کے لئے دیوارِ کعبہ میں ایک نیا دروازہ پیدا کر کے مادر حضرت علیؑ کو اپنے گھر میں بلایا۔

اس موقع پر حقیر نے ایک قطعہ نذرِ امام کیا ہے۔

شرف پایا نہ ہم نے یہ کسی میں — عطائے خاص ہے باب علیؑ میں
غلط ہے شق ہوئی دیوارِ کعبہ — ہنسی تھی وہ تو مولا کی خوشی میں

سرور کائنات نے ابتدا سے ہی حضرت علیؑ کو اپنی زیر تربیت رکھا، یہی وجہ تھی کہ آپ سے زیادہ مزاج دانِ رسالت کوئی اور نہ تھا۔ آپ رسول کریمؐ کی اطاعت اور اتباع میں منزل کمال پر تھے، اس درجہ پر کوئی دوسرا آپ کا ہمسر نہ تھا۔ آپ رسول اللہؐ کے خُلقِ عظیم کا عکس تھے، اشجع عرب غالب علیؑ کلّ غالب تھے۔ میدانِ قتال میں کرّار غیر فرار تھے۔ محرابِ عبادت میں قائم الیل اور صائم النہار تھے۔ رسول کی رسالت کی گواہی میں اللہ کے ساتھ دوسرے گواہ تھے جس کی تصدیق قرآنِ مجید کے سورۂ رعد کی آیت ۴۳ ۵ ویقولُ الذّین - - - - - - - علم الکتاب ۵ کر رہی ہے۔

ترجمہ:- یہ کافر کہتے ہیں کہ تم پیغمبر نہیں ہو تو تم کہہ دو کہ میرے اور تمہارے درمیان میری رسالت کی گواہی کے لئے اللہ کافی ہے اور وہ شخص جس کے پاس علم کتاب ہے۔

آپ نے اپنے عالم علم کتاب ہونے کا دعویٰ اپنے قول سلونی سلونی کے ذریعہ کیا۔ آپ اسی کتاب کے علم کے وارث ہیں جو انبیاء ماسبق کے پاس صحیفوں کی شکل میں آئی، حضرت موسیٰؑ کو توریت کے نام سے، حضرت داؤدؑ کو زبور، حضرت عیسیٰؑ کو انجیل اور حضرت محمد مصطفیٰؐ کو قرآن کی صورت میں ملی۔ اسی کتاب کا تھوڑا سا علم آصف بن برخیا وصی حضرت سلیمانؑ کو ملا تھا جس کی بدولت وہ تختِ بلقیس کو چشم زدن میں دربار حضرت سلیمان میں لے آئے تھے۔ یہ وہی کتاب ہے جس میں اُمم انبیائے ماسبق نے دل کھول کر تحریف کی۔ اُمتِ محمدیہ اس میں لفظاً تحریف تو نہ کرسکی لیکن معناً تحریف میں ہر ایرے غیرے نتھو خیرے نے کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اور تماشہ یہ کہ اگر ان سے خود ان کے مقرر کئے ہوئے معنی کو ہی قبول کرنے کے لئے کہا جائے تو اُس سے انکار کرکے راہِ فرار اختیار کر لیتے ہیں اور نہایت ڈھٹائی سے اپنی ہٹ دھرمی پر قائم رہتے ہیں۔ بقول علامہ اقبال۔

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں

خالقِ کائنات نے اس کتاب قرآن میں آلِ ابراہیم و آلِ عمران کے نام سے جن مصطفیٰ بندوں کا ذکر کیا ہے اُن سے بعد بعد ختمی مرتبت آپ اور آپ کی اولاد طاہرین ہی مُراد ہے۔ رسول اللہ کی یہ حدیث کہ "انا مدینتہ العلم و علیؑ بابھا"۔ آپ کے کمالِ علم پر ایک اور دلیل محکم ہے۔ حضور سرورِ کائنات نے تمام انبیاء کی کُل صفات کا ذاتِ علیؑ میں مجتمع ہو جانے کی وجہ سے آپ کے چہرہ پر نظر کرنا اور آپ کا ذکر کرنا عبادتِ خدا بنایا ہے۔ آپ حاملِ علم کتاب ہونے کی وجہ سے کائنات پر حقِ تصرف رکھتے تھے۔ اور اسی حق تصرف کے کچھ مظاہروں کو دیکھ کر کچھ لوگ معاذ اللہ آپ کو خدا ہی سمجھنے لگے تھے۔ فرقۂ نصیری ابھی تک آپ کو خدا سمجھتا ہے۔ اس موقعہ پر ایک شاعر کا ایک قطعہ بھی ملاحظہ کرتے چلئے۔

وصی کہتا، ولی کہتا، شہ عقدہ کشا کہتا — نظر جلوؤں میں کھو جاتی نہیں معلوم کیا کہتا
علیؑ کعبہ میں پیدا ہو گئے گر سجدہ نہ کر لیتے — نصیری تو نصیری ہے زمانہ بھر خدا کہتا

آپ بعدِ رسولؐ عبدیت کی منزلِ کمال پر تھے اور اکثر فرماتے تھے کہ میں محمدؐ کے غلاموں میں سے ایک غلام ہوں۔ رسول مقبولؐ کی طرح آپ کی زندگی نہایت سادہ تھی۔ محنت مشقت سے کسبِ حلال کرکے موٹا جھوٹا پہن کر، اور روکھی سوکھی جَو کی روٹی کھا کر اپنی پوری زندگی گزاری۔

آپ کا سخت سے سخت ترین دشمن بھی آپ کی پاکبازانہ زندگی کا معترف ہے۔

آپ بعد رسول انسانوں کی ہدایت کیلئے مامور من اللہ تھے۔ اہلِ ایمان برابر آپ سے رُشد وہدایت پاتے رہے۔ اور اہلِ اسلام بھی جب کسی مشکل میں پڑ کر آپ سے مدد کے طالب ہوتے تو وہ آپ کی ہدایت سے مایوس نہیں ہوتے تھے۔ آپ ہادیٔ برحق ہونے کی وجہ سے اپنے دشمن کو بھی کوئی غلط مشورہ نہیں دیتے تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ آپ کے مشورہ پر عمل کرے یا نہ کرے۔

بعدِ رحلتِ رسول جب مسلمانوں نے حضرت ابوبکر کو اپنا خلیفہ خود مقرر کرلیا تو آپ نے حصولِ خلافت (حکومت) کے لئے لڑنے اور فتنہ وفساد برپا کرنے کے مقابلہ میں صبر کو ترجیح دی آپ نے تلوار کو نیام میں رکھ کر پچیس سال تک خاموش زندگی بسر کی اور اس دوران جو جو مصائب آپ پر پڑے نہایت صبر سے ان کو برداشت کیا۔

۳۵ھ میں بعدِ واقعۂ حضرتِ عثمان جب مسلمانوں نے آپ کو اپنا حاکم (خلیفہ) بننے پر اصرار کیا تو آپ نے کچھ شرائط کے بعد اس کو قبول کرلیا اور اس طرح آپ مسلمانوں کے چوتھے خلیفہ بھی شمار ہوتے ہیں۔ آپ نے تختِ خلافت پر بیٹھتے ہی حکومت کو حاکمیتِ الٰہی کے تحت قائم کرنے کی کوشش کی لیکن مسلمانوں نے حاکمیتِ الٰہی کے تحت قائم ہونے والی اس حکومت کو اپنی بغاوتوں اور شورشوں سے ناکام بنادیا اور لطف کی بات یہ کہ اس ناکامی کا الزام بھی حضرت علیؑ پر ہی رکھا۔

آپ نے زندگی بھر اپنے قول وعمل سے انسانوں کی ہدایت کا فریضہ انجام دے کر اپنے مقصد حیات کو پورے طور سے ادا کیا۔ دنیا کے تمام انسانوں کے لئے اپنی زندگی کو صرف اس لئے نمونہ بناکر پیش کیا کہ انسان بلاجبر واکراہ حاکمیتِ الٰہی کو تسلیم کرکے اپنے مقصدِ حیات کو پورا کرے اور امن و سلامتی کی فضا میں سانس لے کر اپنا ذہنی وجسمانی وروحانی سکون حاصل کرے۔

۴۰ھ میں مسجد کوفہ میں ایک بدبخت خارجی ابنِ ملجم نے حالتِ سجدہ میں سر پر تلوار لگا کر آپ کو شہید کردیا۔ اور اس طرح آپ کی ولادت اور شہادت دونوں خدا کے گھر میں ہوئیں۔ آپ کا مدفن نجف اشرف عراق میں آج بھی مرجعِ خلائق ہے۔

آپ کی زندگی کے حالات پر مشتمل کثیر تعداد میں کتابیں ہر زبان میں موجود ہیں۔ مختلف سوانح نگاروں اور مورخوں نے آپ کی سیرت، آپ کے کارناموں اور آپ کے علمی کمالات کا تذکرہ کیا ہے۔ مگر آپ کے بارے میں جتنا بھی لکھا جائے کم ہے۔ کیونکہ آج کل سائنس کا دور ہے لہذا اس کے تعلق سے آپ کے صرف دو ارشادات کا تذکرہ کرنے پر ہی اکتفا کرتا ہوں۔

ایک شخص نے آپ سے سوال کیا کہ زمین سے سورج کتنی دور ہے تو آپ نے اُس کی عقل کے مطابق جواب میں فرمایا کہ اگر ایک عربی النسل گھوڑا اپنی پوری رفتار سے دوڑے اور رات دن بغیر رُکے دوڑتا رہے تو وہ پانچ سو برس میں سورج پر پہنچ جائے گا۔ آج کے دور میں سائنسدانوں نے جدید آلات وحساب کے ذریعہ زمین سے سورج کا جو فاصلہ معلوم کیا ہے وہ فاصلہ چودہ سو سال قبل باب مدینۃ العلم نے بتلادیا تھا۔

دوسرے خطبہ میں آپ نے ارشاد فرمایا کہ زمین کی تہوں سے رزق تلاش کرو۔ گویا آپ نے زمین کے خزانوں کا پتہ دے دیا تھا۔ اب اگر مسلمان ان علومِ سائنس سے کام نہ لے کر پستی میں پڑے رہیں اور دوسری قومیں ان مادی طاقتوں کو اپنے کام میں لے آئیں تو اس میں اُس ہادیٔ برحق کا کیا قصور ہے؟

امام حسنؑ بن علیؑ

خانوادۂ رسالت کے دوسرے ہادی امام حسن علیہ السلام تھے۔ آپ ختمی مرتبت سرور کائناتؐ کے بڑے نواسے اور حضرت علیؑ وفاطمہ زہراؑ کے بڑے بیٹے تھے۔ ۱۵ رمضان ۳ھ میں مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے۔ ساڑھے سات سال تک رسول اللہ کی آغوشِ تربیت میں پرورش پائی۔ سر سے ناف تک رسالتمآب کی شبیہہ تھے۔ سیرتؐ وکردار میں اپنے نانا کی زندہ تصویر تھے۔ خُلقِ حسنؑ زبان زد عام ہے۔ حضور پُر نور نے آپ کو اور آپ کے چھوٹے بھائی امام حسینؑ کو جوانانِ جنّت کا سردار بنایا ہے۔ آپ وارثِ علمِ کتاب تھے۔ آپ کی بصیرت بھی رسولِ مقبولؐ کی طرح تھی۔ آپ نے اپنی حکمت آمیز نصائح سے انسانوں کی ہدایت کا فریضہ انجام دیا۔ صلح وآشتی کے علمبردار تھے۔ ۴۰ھ میں اپنے پدر بزرگوار کی شہادت کے بعد منصبِ امامت پر منجانب اللہ مامور ہوئے۔ اور اسی وقت مسلمانوں نے آپ کو اپنا پانچواں خلیفہ تسلیم کرکے تختِ خلافت پر بٹھایا۔ ابھی انتظام حکومت سنبھالنے بھی نہ پائے تھے

کہ امیر شام نے ۴۱ھ میں خلع خلافت پر مجبور کر دیا۔ آپ کوفہ سے معہ اہلِ بیتِ رسولؐ مدینہ تشریف لے گئے۔ ۵۰ھ تک خاموشی سے کار امامت انجام دیا اور اسی سال ۲۸ صفر کو ایک حکومتی سازش کے تحت زہر دغا سے شہید کر دیئے گئے۔ آپ کی وصیت کے مطابق جب اہلِ خاندان آپ کی میّت روضۂ رسولؐ میں دفن کرنے کے لئے لے گئے تو حضرت عائشہ کی ایماء پر مسلمانوں نے آپ کے جنازہ پر تیروں کی بارش کر کے وہاں پر آپ کو دفن نہ ہونے دیا۔ چنانچہ آپ کو جنّت البقیع میں پہلوئے جنابِ سیّدہ میں دفن کیا گیا۔ آپ کی مدتِ امامت دس سال رہی۔

امام حسینؑ بن علیؑ

خاندانِ نبوّت کے تیسرے ہادی امام حسین علیہ السلام تھے۔ آپ سرورِ کائنات کے چھوٹے نواسے حضرت علیؑ و فاطمہ زہراؑ کے دوسرے فرزند اور امام حسنؑ کے چھوٹے بھائی تھے۔ ۳ شعبان ۴ھ کو مدینہ منورہ میں ولادت ہوئی۔ اپنے بڑے بھائی کے ساتھ اپنے نانا کی آغوشِ تربیت میں پرورش پاتے رہے۔ آپ بھی وارثِ علمِ کتاب تھے۔ آپ ناف سے پا تک اپنے نانا کی شبیہ تھے۔ سیرت و کردار، شجاعت و ہمت میں بالکل رسول اللہ کی طرح تھے۔ سرورِ کائناتؐ اکثر فرماتے تھے کہ حسنؑ و حسینؑ میری دنیا کی بہار ہیں۔ آیۂ مباہلہ کی رُو سے یہ دونوں نواسے فرزندِ رسولؐ کہلاتے ہیں اور اسی نسبت سے امام حسینؑ کی نسل سے تمام ائمہ طاہرین کو فرزندِ رسولؐ کے لقب سے پکارا جاتا ہے۔ اسی آیت مباہلہ کی رُو سے آپ صادقین کی سند پانے والوں میں سے ایک ہیں۔ آیۂ تطہیر میں اپنے نانا، والدِ محترم، والدۂ ماجدہ، اور بڑے بھائی کے ساتھ شامل ہیں یعنی پنجتن پاک کے آخری تن ہیں۔ انھیں پنجتنِ پاک کی محبّت و مودّت کو اللہ نے سورۂ شوریٰ کی آیت ۲۳ میں اجرِ رسالت قرار دیا ہے اور اسی لئے کہا جاتا ہے کہ بے حُبِ اہلبیت عبادت حرام ہے۔ آپ خاص طور سے سورۃ الصّفات کی آیت ۱۰۷ و ۱۰۸ ہ وفدیناہ .... فِی الآخرین ہ کے مصداق ہیں۔ جس کو علامہ اقبالؔ نے ایک شعر میں اس طرح نظم کیا ہے۔

عزیب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم
نہایت اُس کی حسینؑ ابتدا ہیں اسمٰعیلؑ

صبر و رضا، حلم و مروت، شجاعت و سخاوت، عبادت و ریاضت، علم و حکمت تو گویا گھٹی

میں پڑی ہوئی تھیں۔ آپ نفسِ مطمئنہ کی عملی تفسیر تھے۔ ۳۵ھ سے ۴۰ھ تک اپنے والد کی خلافت ظاہری کے زمانہ میں اپنے بڑے بھائی امام حسنؑ اور دیگر بھائیوں محمد حنفیہ وغیرہ کے ساتھ مل کر انتظامِ حکومت میں حصہ لیا۔ جنگِ جمل و جنگ صفین میں کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ ۴۱ھ میں امام حسنؑ کے دست برداریٔ خلافتِ ظاہری کے بعد ان کے ہمراہ کوفہ سے مدینہ آگئے۔ ۵۰ھ میں بھائی کی شہادت کے بعد منصبِ امامت پر فائز ہوئے۔ دس سال تک نہایت خاموشی سے فریضۂ ہدایت ادا کرتے رہے۔ اسی دوران یعنی ۴۱ھ سے ۶۰ھ تک بنی اُمیہ کی طرف سے جو مظالم آپ پر اور آپ کے اہلِ خاندان و اہلبیت رسالت سے محبت رکھنے والوں پر توڑے گئے۔ انہیں نہایت صبر سے برداشت کیا۔

۶۰ھ میں امیر شام کے انتقال کے بعد جب ان کا بیٹا یزید ابنِ معاویہ تختِ خلافت پر بیٹھا تو اس نے آپ سے بیعت لینا چاہی۔ بیعت نہ کرنے کی صورت میں گورنر مدینہ کے ذریعہ مدینہ میں ہی آپ کو قتل کر دینے کا یزیدی منصوبہ بھی تھا۔ آپ نے فوری طور سے معہ اہلِ بیتِ رسولؐ مدینہ سے ہجرت کر کے مکّہ معظمہ میں قیام کیا۔ یزیدی فوج، حاجیوں کا بھیس بدل کر آپ کو قتل کرنے کے ارادہ سے جب مکّہ میں بھی پہنچ گئی تو آپ نے حرمتِ کعبہ قائم رکھنے کے لئے مکّہ معظمہ کو بھی حج سے ایک دن پہلے چھوڑ دیا، اور عراق کی جانب سفر شروع کیا۔ دورانِ قیام مکّہ کوفیوں نے سینکڑوں خطوط بھیج کر آپ کو عراق آنے کی دعوت دی تھی۔ آپ نے عراق جانے سے قبل اپنے چچازاد بھائی مسلم بن عقیل کو اپنا سفیر بنا کر کوفہ بھیجا۔ پہلے پہل تو کوفیوں کی ایک تعداد نے مسلم بن عقیل کے ہاتھ پر بیعتِ حسینؑ کر لی اور اس دھوکہ میں آکر حضرت مسلم نے امام حسینؑ کو تمام حالات سے مطلع کر دیا۔ کوفیوں کے بیعت کر لینے کے بعد فوراً ہی یزید کے حکم سے ابن زیاد کوفہ کا گورنر بن کر کوفہ پہنچ گیا۔ اور اُس نے اپنے ظلم و تشدد سے اہلِ کوفہ کو خوفزدہ و ہراساں کر کے حضرت مسلم کا ساتھ چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ حضرت مسلم تنہا رہ گئے۔ لیکن آپ نے تن تنہا ابنِ زیاد کی ایک کثیر فوج کا مقابلہ کیا۔ مگر آخر کار ایک جنگی چال میں پھنس کر آپ گرفتار ہو گئے۔ دربار ابنِ زیاد میں زخمی حالت میں بھی نہایت جوانمردی کا مظاہرہ کیا۔ اس پر ابنِ زیاد نے آپ کو شہید کرا دیا۔ آپ کی شہادت کی خبر امام حسینؑ کو راستہ میں ملی۔ لیکن انہوں نے سفر برابر جاری رکھا۔ جب آپ کوفہ کے قریب

پہنچے تو لشکر یزید کا ایک سردار حُر آپ کا سدّ راہ ہوا۔ حُر اور اُس کا لشکر اس وقت بہت پیاسا تھا۔ ساقی کوثر کے فرزند نے اُسے اور اس کے تمام سپاہیوں کو معہ اُن کی سواریوں کے اپنے پاس کا سارا پانی پلا دیا۔ اُس کے باوجود حُر کی مزاحمت جاری رہی۔ جس کی وجہ سے آپ کربلا کے لق و دق میدان میں خیمہ زن ہونے پر مجبور ہو گئے۔ آپ نے وہاں نہر فرات کے کنارے اپنے خیمے نصب کئے ہی تھے کہ یزیدی لشکر کا سپہ سالار عمر ابن سعد ایک بہت بڑی فوج کے ساتھ کربلا پہنچ گیا۔ اس نے بحکم ابن زیاد آپ کے خیمے دریا کے کنارے سے اکھڑوا کر تپتے ہوئے ریگستان میں دریا سے بہت دور نصب کرانے پر مجبور کر دیا۔ ساتویں محرّم سے دریا کا پانی بھی آپ پر اور آپ کے اہل و عیال و انصار پر بند کر دیا۔ آپ نے عمر ابنِ سعد سے سلسلہ گفتگو جاری رکھا۔ اس نے آپ کا کوئی عذر قبول نہ کر کے بیعتِ یزید پر اصرار کیا۔ آپ نے یزیدی فوج کو اپنے خونِ ناحق سے بچانے کے لئے ایک اور کوشش کی کہ مملکتِ یزید سے باہر کسی اور جگہ سکونت اختیار کر لیں۔ عمر ابنِ سعد نے اس کو بھی قبول نہ کیا۔ اور ۹ محرم کی شام کو خیام اہلبیت پر حملہ کا حکم دیا۔ آپ نے اس سے ایک شب کی مہلت طلب کر کے اُس کو اور اُس کی فوج کو اپنے خون سے ہاتھ رنگنے سے بچنے کے لئے ایک اور آخری موقعہ دیا۔ جس کو انہوں نے کھو دیا۔ ۱۰ محرم الحرام سنہ ۶۱ھ بروز جمعہ عمر ابن سعد نے اپنی فوج کو حملہ کا حکم دیا اور سب سے پہلے اسی نے خیام اہلبیت کی طرف تیر پھینک کر پہل کی۔ پھر اس کی فوج نے ایک ساتھ حسینؑ اور ان کے ساتھیوں پر حملہ کر دیا۔ سرفروش ساتھیوں نے نہایت پامردی سے مقابلہ کیا لیکن تابہ کے آخر کار دوپہر تک سارا لشکر حسینؑ ختم ہو گیا جس میں بتیس ۳۲ سوار اور تقریباً ساٹھ ۶۰ پیادے تھے۔ اس قلیل فوج میں بھی صغیر السن بچے اور کبیر السن بوڑھے شامل تھے۔ جبکہ یزیدی افواج کی تعداد مورخین نے تقریباً بتیس ہزار بتائی ہے۔ وقتِ عصر امام حسینؑ بھی حالتِ سجدہ معبود شہید کر دیئے گئے۔ خیام اہلبیت میں کہرام اور یزیدی فوج میں جشنِ فتح برپا ہوا۔

اس ذبح عظیم کے بارے میں مختلف مشاہیرِ عالم نے اپنی اپنی استعدادِ معرفت کے لحاظ سے اپنی آرار کا اظہار کیا ہے۔

کسی نے کہا کہ دو ۲ شہزادوں کی جنگ تھی۔ کسی نے کہا کہ حسینؑ اپنے نانا کی تلوار سے ہی قتل ہوئے۔ ایک دوسرے صاحب نے اس قول کی وضاحت اس طرح فرمائی کہ یزید چونکہ خلیفہ برحق تھا

اور اس کے مقابلہ میں حسینؓ باغی تھے۔ لہٰذا باغی کی سزا قتل ہوتی ہی ہے۔ کسی نے حسینؓ کو حق پر اور یزید کو باطل پر سمجھتے ہوئے اس کو حق و باطل کی جنگ قرار دیا اور یزید کو موردِ لعن ٹھہرایا۔ کسی نے کہا کہ اسلام اور کفر کی جنگ تھی۔ کسی نے کہا کہ حسینؓ نے اپنا خون دے کر شجرِ اسلام کو سدا بہار کر دیا۔

محمد علی جوہر صاحب نے فرمایا۔

قتلِ حسینؑ اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

جوشؔ ملیح آبادی صاحب نے فرمایا۔

انسان کو بیدار تو ہو لینے دو
ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسینؑ

خواجہ اجمیری نے فرمایا۔

حقا کہ بنائے لاالہ است حسینؑ

علامہ اقبالؔ نے فرمایا۔

نقش الااللہ بر صحرا نوشت

اور پھر آگے چل کر اپنی کمالِ معرفت پر پہنچ کر فرمایا۔

اسلام کے دامن میں اور اس کے سوا کیا ہے
ایک ضربِ یداللّٰہی ایک سجدۂ شبیری

نجمؔ آفندی نے فرمایا۔

دماغ وضع کئے دل بنا دیئے تو نے
حسینؑ درد کے دریا بہا دیئے تو نے

واقعاتِ شہادت پر مختلف شعرا نے مختلف زبانوں میں طبع آزمائی کی ہے۔ اردو زبان میں انیسؔ و دبیرؔ سرِ فہرست ہیں جنہوں نے ہزاروں مراثی، سلام و قطعات وغیرہ کا ایک بڑا ذخیرہ اُردو ادب کو دیا ہے۔

مختلف سوانح نگاروں نے آپ کی سوانح حیات اپنی اپنی کتابوں میں تحریر کی ہے۔ بمقصد شہادت

پر سینکڑوں کتب بازاروں میں موجود ہیں۔ ہر انسان جو آپ کے واقعات و حالات سے واقف ہوتا ہے وہ آپ سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ ہر صاحبِ دل خواہ وہ کسی مذہب و ملت کا ہو، آپ کے مصائب سن کر رونے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ آپ کی صفِ عزا دنیا کے مختلف ممالک میں ہر سال بچھتی ہے۔ مختلف طریقوں سے آپ کی یاد منائی جاتی ہے۔ مختلف طریقوں سے آپ کا ذکر ہوتا ہے۔ تیرہ سو سال سے مسلسل یہ ذکر ہو رہا ہے وہی واقعات دہرائے جاتے ہیں اور پھر وہی تاثیر و اثر کہ انسان اس سے نہ اکتاتا ہے نہ گھبراتا ہے۔ کبھی آپ نے غور کیا کہ ایسا کیوں ہے؟

خالقِ کائنات رحمان الرحیم اپنے بندوں پر اتنا مہربان ہے کہ وہ ان کی بھلائی اور اُن کے امتحان میں ان کی کامیابی کے لئے جتنی سہولت و آسانی ممکن ہے برابر دے رہا ہے۔ اور شیطان جس کا ایک نام طاغوت ہے مسلسل انسان کو اس کے امتحان میں ناکام کرنے کے درپے ہے۔ اللہ نے انسان کو عقل دے کر اور بُرے بھلے راستے کی نشاندھی کر کے صراطِ مستقیم یعنی اچھا طریقۂ زندگی جو امن و سکون کا ہو گزارنے کی ہدایت کی مگر یہ راستہ بہ جبر قبول کرنے کو نہیں کہا۔

چونکہ انسان کی فطرت میں مظلوم سے ہمدردی ہوتی ہے اس لئے اس نے جتنے بھی معلم انسانوں کی ہدایت کے لئے بھیجے۔ بہ استثنائے چند سب ہی نے مظلومیت کو ذریعہ تبلیغ بنایا۔ حضرت نوحؑ کی قوم آپ پر پتھر برساتی رہی۔ سردارانِ قوم نے ان کو دیوانہ کہا۔ حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں پھینکا گیا۔ حضرت ذکریاؑ کو آرے سے چیرا گیا۔ حضرت یحییٰؑ کا سر کاٹ کر بادشاہ کے دربار میں لایا گیا۔ حضرت عیسیٰؑ کو سولی پر لٹکایا گیا۔ ختمی مرتبت محمد مصطفٰےؐ کو کیسی کیسی تکلیفیں دی گئیں۔ یہی نہیں بلکہ جن انسانوں نے اِن ہادیانِ برحق کی ہدایت قبول کر کے اللہ کی حاکمیت تسلیم کر لی اُن کو بھی ان باغی انسانوں نے اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا۔

دیکھا گیا ہے کہ عام حالات میں بھی وقتی طور سے کچھ انسان ظالم انسانوں سے نفرت کر کے مظلوموں کے ہمدرد بن جاتے ہیں لیکن وقت گزرنے کے ساتھ یہ واقعات داستانِ پارینہ ہو جاتے ہیں۔ تاریخ میں جب ان کا ذکر آتا ہے تو پڑھنے والا کچھ زیادہ متاثر نہیں ہوتا۔ لیکن جو بندے صرف اللہ کے لئے مظلومی اختیار کرتے ہیں ان کا ذکر تازہ رہتا ہے۔

بعد رسول جب ایک وقت ایسا آیا کہ دینِ خدا کو ان اللہ کے باغیوں نے بالکل ہی بدل

ڈالا اور مزید یہ جسارت کی کہ اپنے اختیار کردہ طریقہ پر بیعتِ حسینؑ کی مہر لگوانا چاہی تو اللہ کے دین کی حفاظت کے لئے فرزندِ رسولؐ حسینؑ ابن علیؑ نے کربلا میں وہ لازوال قربانی پیش کی جس نے تمام انبیاء ماسبق اور حضور ختمی مرتبت کی تبلیغی کوششوں کو اکارت ہونے سے بچا لیا۔ اور اسی لئے حضور ختمی مرتبت نے فرمایا کہ "حسین منی وانا من الحسین" یعنی حسین مجھ سے ہے اور میں حسین سے ہوں۔

چونکہ یہ قربانی صرف اللہ کے لئے دی گئی تھی لہذا اللہ نے بھی اس ذکر کو معجزہ بنا کر اس میں اتنا اثر پیدا کر دیا کہ قرآن کی تلاوت کی طرح اس کے ذکر سے بھی انسان نہیں اکتاتا۔ جس طرح چودہ سال سے مسلسل، ہر روز اور ہر وقت قرآن پڑھنے اور سننے سے اکتاہٹ نہیں ہوتی اسی طرح ذکرِ حسینؑ کے پڑھنے یا سننے سے کوئی اکتاہٹ کسی وقت نہیں ہوتی، اور اس کی دلیل یہ ہے کہ تاریخ بشریت میں، ابتداء سے لے کر اب تک ہزاروں واقعات ایسے ہوئے جن میں لاکھوں انسان بیک وقت قتل ہوئے مثلاً، زوالِ بغداد میں لاکھوں انسان وحشیانہ طور سے مارے گئے۔ جنگ عظیم اول و دوم میں کتنی انسانی جانیں ضائع ہوئیں۔ حالیہ واقعات میں تقسیم ہند کے وقت کیسے کیسے روح فرسا مظالم ہوئے۔ ڈھاکہ میں کتنی بیدردی سے انسانی خون بہایا گیا۔ لیکن کسی جگہ بھی ان مقتولوں کی یاد نہیں منائی جاتی۔ مگر حسینؑ کا غم ہر وقت تازہ ہے اور وہ صرف اس لئے کہ انسان جب اس غم سے متاثر ہو اور اس کے دل پر چوٹ لگ کر وہ نرم ہو جائے تو وہ اپنی خوشی سے ظلم سے نفرت کر کے راہِ عدل اختیار کرے۔ یعنی اللہ کی حاکمیت کو بلا جبر و اکراہ قبول کرے ورنہ صرف رونے اور رلانے کو ہی مقصدِ شہادتِ حسینؑ سمجھ لینا نادانی کے سوا کچھ نہیں ہے۔

بہر حال حسینؑ کی مظلومیت کا پہلا اثر اُسی حُر پر ہوا جو آپ کو گھیر کر کربلا لایا تھا۔ یزیدی لشکر کا یہ پہلا سردارِ فوج تھا جو بلا جبر و اکراہ حاکمیتِ الٰہی قبول کر کے اور حق کے ساتھ ہو کر راہِ خدا میں شہید ہوا۔ اسی طرح یزیدی لشکر سے متعدد فوجی، لشکرِ حسینؑ میں آ ملے اور حسینؑ کے ساتھ ہی درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔ اور یہ سلسلہ رکا نہیں، واقعہ کربلا کے بعد سے لاکھوں حُر فوجِ یزیدی سے نکل کر لشکرِ حسینؑ میں شامل ہوئے ہیں اور ہوتے ہی جا رہے ہیں۔ جس نے

گھبرا کر طاغوت کی ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ اس ذکر حسینؑ کو کسی نہ کسی طرح ختم کر دیا جائے اور وہ اپنے دوستوں کے ذریعہ مختلف طریقوں سے مسلسل یہ کوشش کر رہا ہے۔ اس کے دوست بڑے بڑے پوسٹرس، پمفلیٹس اور کتابچے و کتابیں وغیرہ بھی شائع کرتے رہتے ہیں جن کا خلاصہ یہ ہوتا ہے کہ تعزیہ داری شرک ہے، ماتم کرنا اور رونا بدعت ہے، زیاراتِ قبور یا نشانات قبر بنانا شرک و بدعت ہے۔ غرض کہ ان کے نزدیک ہر وہ چیز شرک و بدعت ہے، جس سے محمدؐ و آلِ محمدؐ کی یاد تازہ رہے۔ مگر وہ شاید بھول جاتے ہیں یا قصداً بھلا دیتے ہیں کہ حضور ختمی مرتبت اکثر زیاراتِ قبور و فاتحہ خوانی کے لئے قبرستان جایا کرتے تھے اور خصوصاً شبِ برائت میں تو لازمی طور سے جاتے تھے۔ انہوں نے ام المومنین حضرت اُم سلمہ کو ایک شیشۂ خاک دے کر شہادتِ حسینؑ کی خبر اپنی زندگی میں ہی دے دی تھی اور گریہ کر کے اپنی اُمت کے لئے سنت چھوڑی تھی۔ مشہور صحابی رسولؐ حضرت جابر ابن عبد اللہ انصاری سب سے پہلے زائرِ قبرِ حسینؑ تھے جو مدینہ سے چل کر کربلا آئے تھے۔

بہر حال ذکر حسینؑ خدا نے قائم رکھا ہے اور یہ طاغوتی طاقتیں اُسے ختم نہیں کر سکتیں۔! قرآنِ مجید سورۂ ممتحنہ کی آخری آیت ۱۳ میں ان لوگوں کی نشاندہی کر رہا ہے۔ ٥ یا ایھا الذین .... اھل القبور ٥

ترجمہ آیت: "اے ایمان والو اُس قوم سے دوستی نہ کرو جن پر اللہ غضبناک ہے وہ آخرت سے ایسے ناامید ہوئے جیسے کافر قبر والوں سے"

اور ان کی مثال سورۂ بقر کی آیت ۲۵۶ سے بھی اچھی طرح واضح ہو جائے گی۔ ٥ لا اِکراہ فی الدّین .... فیھا خالدون ٥

ترجمہ: "دین میں کوئی جبر و اکراہ نہیں ہے کیونکہ ہدایت گمراہی سے الگ ظاہر ہو چکی، پس جس نے طاغوت سے انکار کیا اور اللہ پر ایمان لایا تو اس نے وہ مضبوط رسی پکڑ لی جو ٹوٹ ہی نہیں سکتی۔ اللہ مومنوں کا دوست ہے جن کو وہ اندھیروں سے نور کی طرف نکالتا ہے اور جو کافر طاغوت کے دوست ہیں وہ ان انوں کو نور سے اندھیروں کی طرف لے جاتے ہیں۔ یہ سب لوگ اہل دوزخ ہیں جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔"

ایسے ہی افراد کی خدا نے سورۂ بقرکی آیت ۸ سے آیت ۲۱ تک نہایت وضاحت سے تعریف کی ہے۔ ۵ من الناس من یقول .... لعلکم تتقون ۵

ترجمہ آیات :۔ " انسانوں میں وہ انسان بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم خدا پر اور قیامت پر ایمان لائے ۔ وہ اللہ کو اور حقیقی مومنوں کو دھوکا دیتے ہیں حالانکہ وہ خود اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں۔ اور کچھ شعور نہیں رکھتے ۔ اِن کے دلوں میں مرض تھا ہی جو اللہ نے اور بڑھا دیا اور اُن کے اس جھوٹ کے سبب ان پر عذابِ الیم ہے ۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم زمین پر فساد نہ پھیلاؤ تو کہتے ہیں کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں ۔ خبردار یہی لوگ فسادی ہیں لیکن اس بات کو سمجھتے نہیں ۔ اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ جس طرح اور لوگ ایمان لائے تم بھی ایسا ہی ایمان لاؤ تو کہتے ہیں کہ کیا ہم بے وقوف[1] لوگوں کی طرح ایمان لائیں تو خبردار یہی لوگ بے وقوف ہیں لیکن یہ نہیں جانتے ۔ اور جب یہ لوگ اُن مومنوں سے ملاقات کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تو ایمان لا چکے اور جب اپنے شیطانوں کے ساتھ تخلیہ کرتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تو تمہارے ساتھ ہیں ہم تو صرف ان (مومنوں) سے مذاق کرتے ہیں اللہ ان پر ہنستا ہے اور ان کو ڈھیل دیتا ہے کہ وہ اپنی سرکشی میں غلطاں و پیچاں رہیں ۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خرید لی ۔ پھر نہ ان کی تجارت نے ہی ان کو نفع دیا اور نہ ان لوگوں نے ہدایت ہی پائی ۔ ان لوگوں کی مَثَل تو اس شخص کی سی ہے جس نے (رات کے وقت) بھڑکتی ہوئی آگ روشن کی پھر جب آگ نے اُن کے گرد و پیش خوب اُجالا کر دیا تو اللہ نے اس کی روشنی لے لی اور ان کو گھٹا ٹوپ اندھیروں میں چھوڑ دیا کہ اب انہیں کچھ سجھائی نہیں دیتا ۔ (یہ لوگ) بہرے گونگے اور اندھے ہیں کہ اپنی گمراہی سے باز نہیں آ سکتے ۔ یا اُن کی مَثَل ایسی ہے کہ جیسے آسمان میں

---

[1] زبانی اسلام لانے والے یہ لوگ خدا کو بتوں کی شکل میں یعنی ایک پیکرِ محسوس میں دیکھنے کے عادی تھے اسی وجہ سے وہ محمدؐ و آلِ محمدؐ کے بتائے ہوئے اَن دیکھے اور بغیر جسم و جسمانیت کے خدا کے ماننے والے مومنوں کو بے وقوف سمجھتے تھے اور شاید علامہ اقبال نے یہ شعر ایسے ہی لوگوں کے بارے میں کہا ہے کہ

خوگرِ پیکرِ محسوس تھی انساں کی نظر مانتا پھر کوئی اَن دیکھے خدا کو کیونکر

(بارش کی وجہ سے) تاریکی میں (بادل) کی گرج اور بجلی کی چمک کڑک کے مارے آنکھیں بند) اور کانوں میں موت کے خوف سے انگلیاں دے لیتے ہیں لیکن اللہ کافروں کو اپنے گھیرے میں لئے ہوئے ہے۔ قریب ہے کہ بجلی اُن کی آنکھوں کو چوندھیا دے۔ جب ان کے آگے بجلی چمکی تو اس کی روشنی میں چل کھڑے ہوئے اور جب ان پر اندھیرا چھا گیا تو (ٹھٹک کر) کھڑے ہو گئے۔ اگر خدا چاہتا تو یوں بھی اُن سے سننے اور دیکھنے کی قوتیں چھین لیتا۔ بیشک خدا ہر چیز پر قادر ہے۔ اے انسانوں اپنے پروردگار کی عبادت کرو جس نے تم کو اور ان لوگوں کو جو تم سے پہلے تھے پیدا کیا۔ شاید تم پرہیزگار بن جاؤ۔"

اگر آیاتِ مندرجہ بالا کی تشریح کی جائے تو کتاب بہت ضخیم ہو جائے گی لہٰذا صرف ترجمہ پر اکتفا کرتے ہوئے اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ ان جیسی بہت سی آیات کے مصداق لوگ محمدؐ و آل محمدؐ اور خاص طور سے امام حسین علیہ السلام سے منسوب شعائر کو جو درحقیقت شعائر اللہ ہیں شرک و بدعت بتا کر ان کے مٹانے کی اپنی ناکام کوششوں کا انجام بہت جلد دیکھ لیں گے۔ اس موقعہ پر شعراء کے مندرجہ ذیل اشعار قابلِ توجہ ہیں۔

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا
فانوس بن کے جس کی حفاظت ہوا کرے
وہ شمع کیا بجھے جسے روشن خدا کرے

مگر چونکہ بقول علامہ اقبالؔ

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

لہٰذا بولہبی ذہنیت کے افراد کی ہٹ دھرمی ہی ان کے مجرم ہونے کا ثبوت ہوگی۔

حضرت امام حسینؑ اپنے بڑے بھائی کی طرح کل دس سال منصبِ امامت پر فائز رہ کر شہید راہِ خدا ہوئے۔ آپ کا مدفن کربلائے معلیٰ قیامت تک مرجعِ خلائق رہے گا۔

امام علیؑ ابن الحسینؑ

خانوادۂ رسالت کے چوتھے ہادی علیؑ ابن الحسینؑ علیہ السلام تھے۔ آپ امام حسینؑ کے بڑے صاحبزادے۔ اسم گرامی علیؑ کنیت

ابو محمد لقب سید الساجدین، زین العابدین وغیرہ۔ ۳۸ھ میں مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے۔ چند ماہ بعد کوفہ آ گئے۔ دو سال تک اپنے دادا علی مرتضیٰ کی آغوشِ تربیت میں پرورش پائی۔ اُن کی شہادت کے بعد اپنے عم بزرگوار اور والدین کے ہمراہ مدینہ آ گئے۔ دس سال تک اپنے عم بزرگوار امام حسن علیہ السلام کے زیرِ سایہ رہے ان کی شہادت کے بعد دس سال تک اپنے والد کے سایۂ عاطفت میں رہے۔ واقعہ کربلا میں بہ مصلحتِ خدا ایک اور سخت امتحان کے لئے زندہ رہے۔ شہادتِ حسینؑ کے بعد منصبِ امامت پر فائز ہو کر اور اسیرانِ اہلِ حرم کے ساتھ اسیر ہو کر اُن کی ساربانی کرتے ہوئے کوفہ میں دربارِ ابنِ زیاد اور پھر شام میں دربارِ یزید میں پہنچے۔ دونوں درباروں میں اپنے فصیح و بلیغ خطبوں کے ذریعہ حکومت و شہنشاہیت کے پرخچے اڑا کر قید و محن میں اسیر رہے۔ قید سے چھُٹ کر مخدراتِ عصمت و طہارت اہلِ بیتِ رسولؐ کو ساتھ لے کر کربلا ہوتے ہوئے مدینہ منورہ آ گئے۔ ۳۴ سال منصبِ امامت پر فائز رہ کر ہشام بن عبد الملک کے ایماء پر ۹۵ھ میں زہرِ دغا سے شہید کر دیئے گئے اور جنت البقیع میں اپنے عم بزرگوار کے پہلو میں دفن ہوئے۔ ہشام کو آپ سے پرخاش کا سبب یہ ہوا کہ ایک مرتبہ وہ اپنے زمانۂ ولی عہدی میں حج کرنے گیا۔ حجاج کی کثرت سے وہ سنگِ اسود کو بوسہ نہ دے سکا اور ایک بلندی پر بیٹھ کر مجمع کے کم ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ اسی دوران اس نے دیکھا کہ ایک نحیف و لاغر نوجوان بوسیدہ کپڑوں میں ملبوس حجرِ اسود کو بوسہ دینے آیا تو لوگوں نے احتراماً اس کو راستہ دے دیا، جب وہ بوسہ دے کر واپس ہوا تو ہشام نے تجاہلِ عارفانہ سے اپنے مصاحبوں سے دریافت کیا کہ یہ کون شخص ہے؟ فرزدق نامی شاعر نے فی البدیہہ ایک قصیدہ امام کی شان میں پڑھ کر آپ کا تعارف کرایا۔ ہشام نے ناراض ہو کر فرزدق کو قید کر دیا۔ اور امام کے قتل کی تدبیریں کرنے لگا اور بالآخر ان کو شہید کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

خلفاء وقت کی کڑی نگرانی کے باعث آپ نے تبلیغ دین کے لئے دعاؤں کو ذریعہ بنایا آپ کی دعاؤں کا مجموعہ صحیفۂ کاملہ کے نام سے آج بھی طالبانِ ہدایت کی ہدایت کر رہا ہے۔

امام محمدؑ بن علیؑ

گلشنِ رسالت کے پانچویں پھول محمدؑ بن علی علیہ السلام تھے۔ آپ امام زین العابدینؑ کے بڑے صاحبزادے نام محمدؐ، کنیت ابو جعفر، لقب باقر، ۵۷ھ میں مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے، تقریباً ساڑھے تین سال تک اپنے دادا حسینؑ

ابن علیؑ کی آغوشِ تربیت میں رہے۔ واقعہ کربلا میں اہلبیتِ رسولؐ کے ساتھ ہی اسیر ہو کر قید خانۂ شام میں قید رہے۔ بعد رہائی مدینہ میں اپنے والد محترم کے ساتھ رہے۔ ۹۵ھ میں اپنے والد کی شہادت کے بعد منصب امامت پر فائز ہوئے۔ ۱۱۴ھ تک خاموشی سے تبلیغ دین کرتے رہے۔ ہشام بن عبد الملک نے اپنے عہدِ خلافت میں آپ کو بھی زہر دغا سے شہید کرا دیا۔ جنت البقیع میں دفن ہوئے۔ آپ کی مدتِ امامت تقریباً ۱۹ سال رہی۔ اہلسنت کے حنفی فرقہ کے امام اعظم حضرت امام ابو حنیفہ کو آپ کی شاگردی کا شرف حاصل تھا۔ مزید یہ کہ وہ آپ کے صاحبزادے امام جعفر صادق کے بھی شاگرد کہے جاتے ہیں۔ عبد الملک بن مروان کے عہدِ خلافت میں اسلامی سکّہ کا رواج آپ ہی کے مشورہ اور ہدایت پر ہوا۔ رسول اللہ کے مشہور صحابی حضرت جابر بن عبد اللہ انصاری نے رسول اللہ کی پیش گوئی کے مطابق آپ کی زیارت کی تھی۔ آپ سے علوم الٰہی کے اسرار و رموز اس درجہ صادر ہوئے کہ آپ کا لقب ہی باقر العلوم (علم کا پھاڑنے والا) ہو گیا اور اسی لقب سے آپ کو زیادہ تر یاد کیا جاتا ہے۔

امام جعفر صادقؑ

شجر نبوت کے چھٹے ثمر امام جعفر صادق علیہ السلام تھے۔ آپ امام محمد باقرؑ کے بڑے صاحبزادے، نام نامی جعفر، کنیت ابو عبد اللہ، لقب صادق ہے۔ آپ اپنے نام کے ساتھ اپنے لقب سے زیادہ مشہور ہیں۔ ۱۷ ربیع الاول ۸۳ھ میں مدینہ منورہ میں ولادت ہوئی۔ یہی ۱۷ ربیع الاول سرکار رسالت کی بھی تاریخ پیدائش ہے۔ ۱۲ بارہ سال تک اپنے دادا امام زین العابدینؑ کی آغوشِ تربیت میں رہے بعدہٗ ۳۱ سال کی عمر تک اپنے والد ماجد کے زیر سایہ سفر حیات طے کیا۔ ۱۱۴ھ میں اپنے والد کی شہادت کے بعد منصبِ امامت پر فائز ہوئے، ۳۴ سال فرائضِ امامت ادا کر کے ۱۴۸ھ میں خلیفہ منصور عباسی کے ہاتھوں زہر دغا سے شہید کر دیئے گئے اور جنت البقیع میں دفن ہوئے۔ امامانِ خاندانِ پیغمبر کے یہ واحد امام ہیں جنہوں نے بنی اُمیّہ و بنی عباس دونوں خاندانوں کے حکمرانوں کا دور دیکھا۔ آپ ہی وہ واحد امام ہیں جن کو ان دونوں خاندانوں کی باہمی جنگ و جدال کے دوران علانیہ تبلیغ دین کا موقع مل گیا تھا جو آپ سے پہلے یا آپ کے بعد کسی امام کو آزادی سے نہ مل سکا۔ آپ نے فقہ محمدیہ کی تدوین مکمل طور سے کر کے دینِ خدا کو رسوائی سے بچایا۔ چونکہ تدوین فقہ آپ

کے ہی عہد میں ہوئی لہذا اس فقہ کو فقہ جعفری بھی کہتے ہیں۔ مدینہ منورہ میں آپ کے حلقۂ درس میں تقریباً چار ہزار طلبا رہتے تھے۔ فرقۂ مالکی کے پیشوا امام مالک اور فرقۂ حنفی کے پیشوا امام ابوحنیفہ آپ کے شاگردوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ کتاب اصولِ کافی میں رسول اللہؐ کی احادیث کی اسناد آپ سے اور آپ کے والد ماجد سے ہی نقل کی گئی ہیں۔ کتاب جفر و جامعہ کے مصنف بھی آپ ہی ہیں۔ مشہور کیمیا داں جابر بن حیان آپ ہی کا شاگرد تھا، جس نے یورپ میں اپنے نام کا ڈنکہ بجوا دیا تھا۔ غرض کہ آپ کے کارناموں کی فہرست بہت طویل ہے اور یہ کتاب ان سب کی تفصیل کی متحمل نہیں ہے۔

امام موسیٰ کاظمؑ

خانوادۂ رسالت کے ساتویں ہادی امام موسیٰ کاظم علیہ السلام تھے۔ آپ امام جعفر صادقؑ کے چھوٹے فرزند، نام موسیٰ، کنیت ابوالحسن، لقب کاظم، آپ بھی اپنے والد اور دادا کی طرح نام کے ساتھ لقب سے زیادہ مشہور رہیں۔ ۷/صفر ۱۲۸ھ بمقام ابوا آپ کی ولادت باسعادت ہوئی۔ ۲۰ سال کی عمر تک اپنے والد کے زیر تربیت رہے۔ ۱۴۸ھ میں اُن کی شہادت کے بعد منصب ہدایت سنبھالا۔ ۳۵ سال فرائض امامت انجام دے کر ۱۸۳ھ میں قید خانۂ بغداد میں عباسی خلیفہ ہارون الرشید کے ہاتھوں زہر دغا سے شہید ہوئے۔ ہارون نے آپ کی میّت دریائے دجلہ کے پل پر رکھوا کر اعلانِ عام کرایا کہ یہ رافضیوں کے امام کی میّت ہے۔ ہارون کے ایک چچا نے نہایت ادب و احترام کے ساتھ جنازہ اُٹھوا کر کاظمین میں دفن کرایا۔ آپ بھی اپنے آباء و اجداد کی طرح وارثِ علم کتاب تھے۔ بڑے بڑے علمائے وقت آپ کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرتے تھے۔ اپنے علم و فضل، حلم و مروّت، ریاضت و عبادت اور پاکیزہ اخلاق و صفات کی وجہ سے جو خاندانِ پیغمبرؐ کا طرّۂ امتیاز ہے عوام ان سے عقیدت رکھتے تھے اور یہی بات خلفاء وقت کے لئے باعثِ تشویش ہوتی تھی جس کی وجہ سے وہ ان کو اور ان کے پیرووں کو ظلم و ستم کا نشانہ بناتے تھے۔ آپ کی تصنیفات میں سے ایک کتاب مسند امام موسیٰ کاظمؑ کے نام سے موسوم ہے۔

امام علی الرضاؑ

اہلبیتِ رسالت کے آٹھویں ہادی امام علی الرضا علیہ السلام تھے۔ آپ امام موسیٰ کاظمؑ کے بڑے صاحبزادے، اسم مبارک علی، کنیت

ابوالحسن لقب رضا تھا۔ آپ بھی اپنے نام کے ساتھ اپنے لقب سے مشہور رہیں۔ ۱۵۳ھ بمقام مدینہ منورہ ولادت ہوئی۔ اپنے والد کے زمانہ حیات ظاہری میں تیس ۳۰ سال تک اُن کے قید و بند اور ایذا رسانیوں پر صبر کیا۔ ۱۸۳ھ میں ان کی شہادت کے بعد منصبِ امامت پر مامور من اللہ ہوئے۔ ۲۰ سال تک کارِ امامت انجام دے کر ۲۰۳ھ میں مامون عباسی کے دیئے ہوئے زہر دغا سے شہید ہو کر شہر طوس (ایران) میں مدفون ہوئے۔ حاملِ نورِ رسالت اور وارث علم کتاب ہونے کی وجہ سے اپنے زمانہ کے تمام علماء پر فوقیت رکھتے تھے۔ دربار مامون کے مناظروں میں مخالف لوگ ہمیشہ راہ فرار اختیار کرتے تھے۔ عباسی خلیفہ مامون نے ازراہِ مصلحتِ حکومت آپ کو اپنا ولی عہد بنایا تھا جو آپ نے اس شرط پر منظور کیا تھا کہ کار و بارِ سلطنت میں دخل نہ دیں گے۔ مگر مامون نے اپنی حکومت کے استحکام کے بعد جب آپ کو اپنے اقتدار کے لئے خطرہ خیال کیا تو انگوروں میں زہر دے کر شہید کر دیا۔ لیکن بظاہر آپ کا غم منا کر پیروانِ آلِ محمدؐ کو اپنے سے بدظن بھی نہ ہونے دیا۔ آپ کے فضائل و مناقب اس قدر ہیں کہ جن کے بیان کی یہ مختصر کتاب متحمل نہیں ہے۔ اگر ناظرین کرام ان تمام ہادیانِ برحق یعنی ائمہ اہلبیت کے حالاتِ زندگی معلوم کرنا چاہیں تو پھر ان کی سوانحِ حیات کا مطالعہ کریں جو مختلف سوانح نگاروں نے اپنی مختلف کتابوں میں تحریر کی ہیں۔ آپ امام ضامن کے نام سے بھی موسوم ہیں۔ مسلمانوں میں جو ایک رسم امام ضامن کے نام سے جاری و رائج ہے کہ پانچ پیسہ، پانچ آنے، سوا روپیہ یا پانچ روپے ایک کپڑے میں باندھ کر کسی کی سلامتی کے لئے اس کے بازو پر باندھ دیتے ہیں اور جس کا مظاہرہ جناب احتشام الحق تھانوی صاحب نے بھی ایوب خان مرحوم سابق سربراہِ مملکت پاکستان کے بازو پر باندھ کر کیا تھا وہ آپ ہی سے منسوب ہے۔ اہل تشیع تو خیر اپنے مذہبی عقیدے کی بنا پر ایسا کرتے ہیں لیکن اہلسنت ایسا کیوں کرتے ہیں یہ راز ابھی تک سمجھ میں نہیں آیا۔ شاید اس کی وجہ پیرانِ پیر شیخ عبدالقادر جیلانی کے پیر طریقت جناب معروف کرخی جو امام رضا کے ایک خادم تھے کے واقعہ سے مربوط ہو، جو یہ ہے کہ ایک تاجر جو آلِ محمدؐ کا عقیدت مند تھا جب اپنے سمندری سفر پر جاتا تو امام علی الرضا علیہ السلام سے اپنے سفر کے بخیر و خوبی انجام پذیر ہونے کی ضمانت لے کر جاتا تھا۔ ایک مرتبہ جب وہ سفر پر جانے لگا تو امام سے ملاقات نہ ہو سکی۔ بہت پریشان

اور ہراساں تھا۔ معروف کرخی نے اُس کی پریشانی دیکھ کر اُس سے اس کا سبب دریافت کیا۔ اس نے وجہ بتا دی۔ جس پر حضرت معروف کرخی نے اس کو ایک پرچہ دیا کہ جب کبھی سمندر میں طوفان ہو اور جہاز کو خطرہ ہو تو اس پرچہ کو سمندر میں ڈال دینا۔ تاجر بادلِ ناخواستہ اس پرچہ کو ساتھ لے کر اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔ ناگہاں ایک مقام پر سمندری طوفان میں گھر گیا۔ اس نے وہ پرچہ نکال کر پڑھا اور سمندر میں ڈال دیا، طوفان ختم ہو گیا۔ پھر تو اُسے معروف کرخی کی کرامت پر یقین آ گیا کہ امام کے خادموں میں بھی ایسی کرامت موجود ہے۔ پرچہ میں لکھا تھا۔

"اے سمندر تجھے معروف کرخی کے سر کی قسم تو ساکن ہو جا"

امام محمد تقیؑ

خانوادۂ رسالت کے نویں ہادئ برحق امام محمد تقی علیہ السلام تھے۔ آپ امام علی الرضاؑ کے بڑے فرزند۔ اسم گرامی محمد، کنیت ابوجعفر لقب تقی جوادؑ آپ بھی اپنے نام اور لقب سے زیادہ مشہور ہیں۔ ۱۰ رجب ۱۹۵ھ میں مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے۔ آٹھ سال کی عمر میں ہی سایۂ پدری سے محروم ہو کر ۲۰۳ھ میں منصبِ امامت سنبھالا۔ سترہ سال تک کارِ امامت انجام دیا۔ ۲۲۰ھ میں پچیس سال کی عمر میں مامون کے بھائی معتصم باللہ نے بغداد بلا کر زہر دغا سے شہید کر دیا۔ کاظمین میں اپنے دادا موسیٰ کاظم کے پہلو میں دفن ہوئے۔ علم و حکمت میں یکتائے زمانہ، وارثِ علمِ رسولؐ، عالمِ علمِ کتاب تھے، سیرت و کردار میں اپنے آبا و اجداد کی زندہ تصویر۔ اپنے زمانہ کے مشہور عالم یحییٰ بن اکثم کے نام نہاد علم کا بھانڈا دربارِ مامون میں پھوڑ کر اپنی برتری تسلیم کرائی۔ مامون کو اپنے عالمِ علمِ غیب ہونے کا ثبوت سرِ راہ دیا جب کہ اس نے اپنی مٹھی میں دبائی ہوئی اس مچھلی کے بارے میں دریافت کیا جو اس کے شکاری باز نے ابرِ سیاہ میں سے حاصل کر کے اُسے دی تھی، کیونکہ انبیاء اور رسولوں کی طرح امام بھی پیدائشی امام ہوتے ہیں۔ ان کا علم وہبی ہوتا ہے، کسبی نہیں ہوتا۔

امام علی نقیؑ

خانوادۂ رسالت کے دسویں ہادی امام علی نقی علیہ السلام تھے، آپ امام محمد تقیؑ کے بڑے صاحبزادے، نام علی، کنیت ابوالحسن، لقب نقی تھا۔ آپ بھی اپنے نام کے ساتھ اپنے لقب سے مشہور ہیں۔ ۵ رجب ۲۱۴ھ میں مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے۔ صرف چھ سال کی عمر میں آغوشِ پدری سے محروم ہو کر ۲۲۰ھ میں منصبِ امامت پر فائز ہوئے۔

۲۴۳ھ میں متوکل عباسی نے مدینہ سے بلوا کر بمقام سرمن رائے قید کر دیا۔ ۱۱ سال قید میں گزارے اور اسی حالت قید میں ۲۵۴ھ میں عباسی خلیفہ معتز باللہ نے آپ کو زہر دے کر شہید کر دیا۔ آپ کا مدفن سرمن رائے ہی ہے۔ مدتِ امامت ۳۴ سال ہوئی۔ آپ بھی اپنے اجداد کی طرح وارثِ علم کتاب ہونے کی وجہ سے کائنات پر پورا تصرف رکھتے تھے۔ متوکل عباسی نے جب بطور امتحان آپ کو بھوکے شیروں کے کٹہرے میں ڈالا تو وہ جنگلی شیر آپ کے قدموس ہو گئے۔ اپنے زمانۂ قید میں متوکل کی بیماری کا علاج اس کی ماں کی درخواست پر بتایا اور وہ اس مرض سے صحتیاب ہو گیا۔ ان تمام واضح دلائل وشواہد کو جان کر بھی یہ خلفاء وقت محمدؐ و آلِ محمدؐ کے دشمن ہی رہے اور ان کو مٹانے کی برابر سعی کرتے رہے۔

امام حسن عسکریؑ اہلبیت نبوت کے گیارہویں ہادی امام حسن عسکری علیہ السلام تھے آپ امام علی نقیؑ کے بڑے فرزند تھے۔ اسم مبارک حسن، کنیت ابو محمد اور شہر سرمن رائے کے محلہ عسکر میں مقیم ہونے کی وجہ سے عسکری لقب پایا۔ اپنے نام اور لقب سے زیادہ مشہور ہیں۔ ۱۰ ربیع الثانی ۲۳۲ھ میں مدینہ منورہ میں ولادت ہوئی۔ ۲۳ سال تک پدر بزرگوار کا سایہ سر پر رہا۔ ۲۵۴ھ میں والد کی شہادت کے بعد منصبِ امامت پر سرفراز ہوئے۔ ۶ سال تک کارِ امامت انجام دے کر ۲۶۰ھ میں عباسی خلیفہ معتمد علی اللہ کے ہاتھوں درجۂ شہادت پر فائز ہو کر سامرہ میں اپنے والد کے پہلو میں دفن ہوئے۔ اپنے آباء طاہرین کی طرح آپ بھی خلفاء وقت کے نشانۂ ظلم بنتے رہے۔ لیکن جب اسلام پر کوئی وقت پڑتا تھا تو سوائے آلِ محمدؐ کے اور کوئی کام نہ آتا تھا۔ چنانچہ اسحاق کندی کا واقعہ بہت مشہور ہے کہ یہ فلسفی تناقص القرآن کے نام سے ایک کتاب لکھ رہا تھا کہ وہ اپنے ہی ایک شاگرد کے ایک سوال پر لاجواب ہو کر اپنے ارادہ سے باز رہا اور یہ سوال اس کے شاگرد کو امام حسن عسکریؑ ہی نے بتایا تھا۔

تجزیہ محمد مصطفٰےؐ سے لے کر امام حسن عسکریؑ تک تمام معلمانِ دین نے انسانوں کی ہدایت کے لئے اپنے قول وعمل سے سعی بلیغ کی، ان سب ہادیانِ برحق کا مقصد اللہ کی حاکمیت کو تسلیم کرانا تھا۔ ان سب میں کہیں اور کسی جگہ نہ تو اصولی اختلاف ہے نہ فروعی۔ جو پہلے نے کہا اور کیا وہی ہر ایک نے کہا اور کیا۔ ان میں سے کسی نے بھی اپنی حکومت اور اقتدار قائم کرنے کی کوشش تو

کوشش تصور تک نہ کیا۔ ان میں سے کسی ایک نے بھی حاکمیتِ الٰہی کو جبر یہ طور سے منوانے کے لئے کسی ایک متنفس پر ظلم وستم نہیں کیا۔ اگرچہ خود انائی اقتدار کے ہاتھوں نشانۂ ظلم بنے رہے۔ ان سب نے راہِ خدا میں اپنی جانیں نثار کیں۔ یہی نہیں بلکہ اپنی پوری زندگی اللہ کے لئے وقف کردی۔ اُسی کے لئے جیئے اُسی کے لئے مرے۔ لہذا ہمارا ایمان ہے کہ یہ سب حضراتِ مقدس از روئے قرآن درجۂ شہادت پر فائز ہوکر، زندہ ہیں اور اپنے رب سے اپنا رزق پاتے ہیں اگرچہ کہ ہمیں اس کا شعور نہیں ہے۔ یہ ہمارے اعمال کو دیکھتے ہیں، ہمارا درود وسلام ان تک پہنچتا ہے، ان کے مدفن ہمارے لئے زیارت گاہیں ہیں۔ اور آج تک منکرین کو دعوتِ عقل دے رہے ہیں۔ نجفِ اشرف میں مرقد مطہر علی ابن ابیطالب کا یہ اعجاز آج بھی جس کا جی چاہے آزمالے اور تصدیق کرے کہ حدودِ مزارِ مقدس میں شراب اور کتا نہیں داخل ہوسکتے! اسی طرح اور تمام ائمہ اہلبیت کے مزارات عجیب وغریب کرامات کے سبب مرجع خلائق بنے ہوئے ہیں۔ اور جن ائمہ کے مزارات جابر حکمرانوں نے مسمار کرادیے ہیں، تو ان کے نشاناتِ قبور بھی زیارت گاہِ عوام ہیں۔ ان تمام شہدائے راہِ خدا کا زندہ رہنا تو خیر قرآن سے ہی ثابت ہے لیکن جو لوگ محبانِ اہلبیت ومتمسکانِ آلِ رسولؐ سے اپنی طبعی موت بھی مرتے ہیں وہ بھی حدیثِ رسولؐ "من مات علی حُبّ آلِ محمد مات شھیدا" (یعنی جو کوئی محبّت آلِ رسولؐ پر مرجائے شہید مرتا ہے) کی رُو سے زندہ رہتے ہیں۔ اور اپنے پروردگار سے اپنا رزق جو اُن کے لئے مقرر ہے پاتے ہیں، اور اس کا زندہ ثبوت حضور سرورِ کائنات کے دو مشہور صحابہ حضرت حذیفہ یمانی اور حضرت جابر بن عبداللہ انصاری کے کے اجسام مبارک ہیں جو تیرہ سو سال گزرنے کے بعد بھی ویسے ہی رہے جیسے ان کے دفن کرنے کے وقت تھے۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا غالباً ۱۹۳۵ء کی بات ہے کہ عراق میں دریائے دجلہ کے کنارے ان کی قبروں سے ان کے اجسام کو ان کی ہدایت کے مطابق، حاکمِ وقت، اور مفتی شہر نے، دنیا بھر کے لاکھوں مسلمانوں اور عیسائیوں وغیرہ کے سامنے نکال کر ایک بہت بڑے جلوسِ جنازہ کی صورت میں، ان کی میتوں کو مدائن میں، حضرت سلمان فارسی کے پہلو میں دفن کرایا ہے۔ اب بھی دنیا میں ایسے بہت سے افراد موجود ہیں جنہوں نے آپ کے جنازوں کو کاندھا دینے کا شرف حاصل کیا ہے، اور جو اس واقعہ کے عینی گواہ ہیں۔ ان دونوں اصحابِ رسولؐ میں سے ایک صحابی کا کفن چھوٹا ہونے کی وجہ سے اُن کے پیروں کو گھاس سے ڈھک دیا گیا تھا اور قدرتِ خدا دیکھو کہ وہ گھاس بھی اُسی طرح ہری تھی جس

اب تیرہ سو برس پہلے وقت دفن تھی۔ اس منظر کو دیکھ کر سینکڑوں عیسائی مسلمان ہو گئے تھے۔ مگر حیف
کہ خود مسلمان اس سے عبرت نہ حاصل کر سکے۔ حضورؐ کے یہ دونوں صحابی جو اپنی طبعی موت مرے تھے،
اُسی گروہِ مومنین سے تعلق رکھتے ہیں جو محمدؐ و آلِ محمدؐ کے علاوہ کسی اور کو اپنا پیشوا اور ہادی نہیں سمجھتا۔

امام مہدیؑ

چمنستانِ رسالت کے بارہویں اور آخری پھول امام زمانہ امام مہدی علیہ السلام ہیں، آپ امام حسن عسکریؑ کے اکلوتے فرزند ہیں۔ آپ کا اسمِ گرامی "م۔ح۔م۔د"، القاب مہدی، قائم، منتظر، خلفِ صالح، حجۃ اللہ وغیرہ ہیں۔ اپنے نام کے ساتھ لقبِ مہدی سے اور بغیر نام، قائم، منتظر اور امام زمانہ سے زیادہ تر یاد کئے جاتے ہیں۔ ۱۵ شعبان ۲۵۶ھ میں شہر سُر من رائے (سامرہ) میں ولادتِ باسعادت ہوئی۔ بقاعدہ ابجد لفظ نور سے آپ کا سنِ ولادت معلوم ہو جاتا ہے۔ خلیفۂ وقت معتمد علی اللہ نے جو دشمنیٔ اہلِ بیتِ رسولؐ میں اپنے باپ متوکل کی طرح مشہور ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ رسولؐ کے گیارہویں جانشین کے بعد بارہواں امام اسی گھر سے پیدا ہو گا آپ کے گھر والوں اور خصوصاً ازواج امام حسن عسکری علیہ السلام پر اپنی مقرر کردہ دائیوں اور مخبر عورتوں کے ذریعہ کڑی نگرانی شروع کر دی تھی کہ اگر وہ بچہ پیدا ہو جس کی رسولؐ نے بشارت دی ہے تو اُسے فوراً قتل کر دیا جائے۔ فرعون نے بھی حضرت موسیٰ کی تلاش و جستجو میں ایسا ہی کیا تھا اور اس نے تو یہ غضب بھی کیا تھا کہ حضرت موسیٰؑ کے دھوکے میں بنی اسرائیل کے لڑکوں کو قتل کرا دیا تھا، لیکن جس طرح فرعون کی آرزو پوری نہیں ہوئی اُسی طرح معتمد عباسی اس نورِ خدا کو بجھانے میں ناکام رہا۔ امام زمانہ پانچ سال کی عمر تک اپنے پدر بزرگوار کی آغوشِ شفقت میں پرورش پاتے رہے۔ جب بھی خلیفہ کی جانب سے مخبروں کے ذریعہ اطلاع ملنے پر آپ کے دولت کدہ پر آپ کی تلاش و جستجو ہوتی آپ بحکم خدا سرکاری کارندوں کی نظروں سے مستور ہو جاتے۔ اور وہ بے نیل و مرام اپنے آقا کے پاس پہنچ کر اپنی ناکامی کی اطلاع دیتے۔ ۲۶۰ھ میں جب معتمد نے حضرت امام حسن عسکریؑ کو شہید کر دیا تو امام منتظر نے صرف پانچ سال کی عمر میں ہی منصبِ امامت کو سنبھال لیا۔ اپنی امامت کا ثبوت فوری طور سے آپ نے اس طرح دیا کہ جب آپ کے والد کی شہادت کے بعد آپ کے ایک چچا جعفر نے دعویٰ امامت کر کے امام حسن عسکریؑ کے جنازہ کی نماز پڑھانی چاہی تو امام منتظر نے ان کو ایسا کرنے سے روک کر خود نمازِ جنازہ پڑھائی۔ پھر بھی جب وہ اپنی امامت پر مُصر رہے تو ایسی تہدید

فرمائی کہ وہ اپنے دعویٰ سے دستبردار ہوکر تائب ہو گئے اور جعفر کذاب سے جعفر توّاب کہلائے۔ امام زمانہ اپنے پدر بزرگوار کی شہادت کے بعد تقریباً پانچ چھ سال تک غیبتِ صغرا میں رہے یعنی کبھی ظاہر رہے کبھی مستور رہے اور اسی طرح فرائض ہدایت انجام دیتے رہے۔ پھر خدائے قادر وقدیر نے اپنی مصلحت سے آپ کو غیبتِ کبرا میں مستور کر دیا۔ جب حکم ہو گا ظاہر ہو جائیں گے۔ لیکن آپ غیبتِ کبرا میں مستور رہ کر بھی طالبانِ ہدایت کی ہدایت برابر فرما رہے ہیں۔ تمام مذاہب عالم کی مذہبی کتابوں میں آپ کا ذکر مختلف ناموں سے ہے، اور تقریباً سب ہی کو آپ کا انتظار ہے۔ مسلمانوں کے بھی اکثر فرقے آپ کے قربِ قیامت پیدا ہونے پر یقین رکھتے ہیں سوائے فرقۂ اثنا عشریہ کے کہ وہ آپ کو اپنے زمانہ کا امام مانتا ہے اور پردۂ غیبت میں مستور ہونے کے باوجود اُن کے زندہ و موجود ہونے کا یقین رکھتا ہے۔ اور یہ بات قدرتِ خدا سے بعید بھی نہیں ہے۔ جب حضرت ادریسؑ حضرت الیاسؑ، حضرت خضرؑ، حضرت عیسیٰؑ اور اصحابِ کہف ہزاروں سال گزر جانے کے بعد بھی زندہ ہیں اگرچہ اُن کو اس زمانہ والوں نے نہیں دیکھا ہے تو پھر اگر امام زمانہ پردۂ غیبت میں زندہ و موجود ہو تو تعجب اور شک کیوں ہو۔ ایسے واقعات اور شواہد بے شمار ہیں جن سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ آپ نے اپنے معتقدین کی ہر مشکل میں مدد کی ہے اور بہت سوں نے تو آپ کی زیارت کا شرف بھی حاصل کیا ہے۔ حدیثِ ثقلین اور قرآنِ مجید کی بہت سی آیات کی رُو سے بھی قرآنِ مجید کے ساتھ عترتِ رسول سے، ایک راسخون فی العلم کا ہر زمانہ میں موجود رہنا لازمی ہے کیونکہ کوئی زمانہ حجتِ خدا سے خالی نہیں رہ سکتا۔

ادارۂ فروغِ انسانیت کراچی

● انسانیت کے فروغ کے لئے

● ادارۂ فروغِ انسانیت

● آپ کے عملی تعاون کا

خواستگار ہے

مکتبۂ فروغِ انسانیت پاکستان

۳/۲۱۱ لیاقت آباد، کراچی

باب پنجم

منزلِ مقصود

سیاسیات، معاشیات، مذہبیات

اگرچہ یہ تینوں عنوان علیحدہ علیحدہ معلوم ہوتے ہیں لیکن سب کی اصل ایک ہی ہے۔ یہ تینوں شعبہ ہائے حیات ایک دوسرے سے اتنے مربوط ہیں کہ کسی طرح سے علیحدہ نہیں ہو سکتے۔ اوّل الذکر سیاست و معیشت دونوں مذہب ہی کے تحت ہیں اور آخر کار اس میں ضم ہو جاتے ہیں۔ آج کے دور میں انسانوں نے سیاست اور معیشت کو مذہب سے الگ کر کے اور پھر سیاست اور معیشت کو بھی علیحدہ علیحدہ کر کے ایک ایسا ہنگامہ برپا کر رکھا ہے جس نے دنیا کے تمام انسانوں کا سکون برباد کر دیا ہے۔ پورے کرۂ ارض پر بے چینی اور بد امنی کی فضا طاری ہے۔ ہر طرف خوف و ہراس پھیلا ہوا ہے۔ ایسے اسلحہ بن چکے ہیں اور بن رہے ہیں جن سے چشم زدن میں انسان صفحۂ ہستی سے مٹ جائیں گے۔ پہاڑ اڑ جائیں گے بالفاظ دیگر قیامت آجائے گی۔ ایسا کیوں ہے اور کیوں ہوگا تو اس مختصر سی کتاب میں کچھ اجمالاً وضاحت کی کوشش کی ہے جو صاحبانِ عقل و دانش کے لئے ایک دعوت فکر ہے۔ بلحاظ عنوانِ بالا سیاست کو مقدّم کرتے ہوئے پہلے کچھ تذکرہ اسی کا کیا جاتا ہے۔

سیاست

کسی بھی خطۂ ارض پر بسنے والی مخلوق خواہ وہ کسی نوع کی ہو اپنی اجتماعی حیات کو جس نظام کے تحت بسر کرتی ہے اُسے سیاست کہتے ہیں، اور اس کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک سیاستِ الٰہیہ اور دوسری سیاستِ انسانیہ یا مخلوقیہ۔ سیاستِ الٰہیہ کی بنیاد حاکمیتِ الٰہی پر قائم ہوتی ہے اور اصولاً کبھی نہیں بدلتی البتہ فروعی طور پر زمانہ، مقام اور حالات کے اعتبار سے تبدیلیاں ہوسکتی ہیں، یعنی اس کے اصول ہر زمانہ، ہر مقام اور ہر حالت میں ایک ہی رہتے ہیں۔ لیکن فروع میں فرق ہو جایا کرتا ہے۔

سیاستِ انسانیہ میں محور اقتدار انسان ہوتا ہے اس کا کوئی اصول نہیں ہوتا سوائے اس کے کہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ اس کے اصول و فروع خود انسان بناتا ہے جو ہر زمانہ، ہر مقام اور حالات کے تحت تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔

اجتماعی حیات کا جو نظام سیاستِ الٰہیہ کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے اُس میں امن و سلامتی، سکون و اطمینان اور فلاحِ مخلوق ہوتی ہے۔

حیاتِ اجتماعی کا جو نظام سیاستِ انسانیہ کے تحت وجود میں آتا ہے اُس میں فتنہ و فساد، قتل و خونریزی، جبر و تشدد، ظلم و حق تلفی، خوف و ہراس اور بے اطمینانی ہوتی ہے۔

سیاستِ الٰہیہ میں انسان اپنی عزتِ نفس (خودی) کو برقرار رکھتے ہوئے ایک آزاد زندگی گزارتا ہے۔

سیاستِ انسانیہ میں انسان اپنی عزتِ نفس کو مجروح کرتے ہوئے غلام در غلام بن جاتا ہے۔

سیاستِ الٰہیہ مذہب کا جزو لاینفک ہوتی ہے لیکن سیاستِ انسانیہ میں سیاست اور مذہب کو کبھی علیحدہ علیحدہ کر دیا جاتا ہے۔ کبھی سرے سے مذہب کا ہی انکار ہوتا ہے اور کبھی صرف مذہب کا نام لے کر انسانی اقتدار برقرار رکھا جاتا ہے۔

خالقِ کائنات نے اپنی تمام نوع مخلوق بشمول انسان کو مدنی الطبع پیدا کیا ہے یعنی مِل جُل کر رہنے والا۔ اور اس کا مشاہدہ ہر انسان بخوبی کر سکتا ہے۔ انسانوں کے قبائل جانورانِ صحرائی کے گلّے، پرندوں کی ٹکڑیاں، آبی مخلوقات کے جھنڈ، تحت الارض بسنے والی مخلوق کے بڑے بڑے کنبے۔ غرض کہ ہر نوع کی مخلوق جو نظر آسکتی ہے انسان کے مشاہدہ میں ہے۔ ماہرینِ حیاتیات ان

ہیں سے کچھ نوع مخلوق کے انفرادی اور اجتماعی نظام حیات کا مطالعہ کرنے میں مسلسل مصروف ہیں اور اپنے مشاہدات کو انسانوں کی معلومات میں اضافہ کے لئے پیش کرتے رہتے ہیں۔ ان تمام مخلوقات میں سے یہاں صرف اللہ کی ایک چھوٹی سی مخلوق شہد کی مکھی کے اجتماعی نظامِ حیات سے سیاستِ الٰہیہ کی مثال پیش کی جا رہی ہے۔

جبکہ آپ کو یہ معلوم ہو گیا کہ اس کی تمام مخلوق مدنی الطبع ہے اور اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے میں ایک دوسرے کی محتاج ہے تو اُس نے اپنی ہر نوع مخلوق میں اُس کی ہر فرد کو جداگانہ صلاحیتوں کا حامل بنایا ہے۔ مثلاً کچھ مزدور ہوتے ہیں، کچھ معمار ہوتے ہیں، کچھ انجینئر ہوتے ہیں، کچھ رزق مہیا کرتے ہیں، کچھ محافظ قانون ہوتے ہیں۔ غرض کہ جس کی جیسی انفرادی اور اجتماعی ضرورتیں ہوتی ہیں اُن کے مطابق اس نوعِ مخلوق میں انفرادی طور سے تمام صلاحیتیں فطری طور سے موجود ہوتی ہیں۔ چنانچہ ماہرینِ حیاتیات نے شہد کی مکھی کے بارے میں جو مجملاً بتایا ہے وہ یہ ہے کہ ہر چھتہ میں ایک ملکہ مکھی ہوتی ہے جو چھتہ کی حکمران ہوتی ہے۔ چھتے کے نظم و نسق کی نگرانی کے علاوہ اس کا کام انڈے دینا ہوتا ہے۔ معمار مکھیاں چھتہ تیار کرتی ہیں۔ کارندہ مکھیاں شہد اکٹھا کرتی ہیں۔ کچھ چھتہ کی حفاظت پر مامور ہوتی ہیں۔ کچھ بچوں کی نگہداشت و پرورش اور حفاظت کرتی ہیں۔ ملکہ مکھی جسے یعسوب بھی کہتے ہیں، اس کا ایک کام یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ کارندہ مکھیوں کے منہ کو سونگھ کر یہ معلوم کرے کہ آیا وہ کسی ایسے پھول کا رس لے کر تو نہیں آئیں جو مضرِ صحت ہو۔ اگر کوئی کارندہ مکھی ایسا کرتی ہے تو یعسوب اس کو ہلاک کر کے چھتے سے نیچے پھینک دیتی ہے۔ ملکہ مکھی جو تولید نسل کرتی ہے اُس میں سے جو ملکہ مکھی پیدا ہوتی ہے وہ اس چھتہ سے نکل کر اسی طرح کوئی اور چھتہ بناتی ہے۔ غرض کہ ایک پورا نظام حیات اجتماعی اور انفرادی، سیاستِ الٰہیہ کے تحت جاری و ساری ہے جس میں کبھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اسی طرح اس کی ہر نوع مخلوق سوائے انسان کے اپنے نظام حیات کو سیاستِ الٰہیہ کے تحت مسلسل بسر کر رہی ہے۔

اگرچہ اللہ نے انسان کے لئے بھی اپنی دیگر مخلوقات کی طرح اس کی اپنی انفرادی اور اجتماعی حیات بسر کرنے کے لئے اس کی تمام ضرورتوں کا سامان مہیا کر دیا ہے لیکن چونکہ اُسے عقل دے کر اشرف المخلوقات بنایا تھا اور منزلِ امتحان پر رکھا تھا کہ یہ انسان، شیطان کے چیلنج کا جو اُس نے خدا کے مقابلہ پر دیا تھا، جواب دے کر خدا کی بات اونچی رکھے اور اپنے انفرادی اور اجتماعی نظام حیات کو اللہ کے

فرستادہ ہادیوں اور معلّموں کی ہدایت کے مطابق استوار کرکے فتنہ وفساد نہ پھیلائے کہ یہ چیز خود اس کے لئے بھی باعثِ تکلیف ہوگی۔ مگر انسان نے شیطان کی پیروی کرکے خدا کے احکام کو جو ان ہادیوں کے ذریعہ اُس تک پہنچ رہے تھے ماننے سے انکار کردیا اور سیاستِ الٰہیہ کی بجائے انسانی سیاست کے تحت اپنے قائم کردہ نظامِ حیات پر کاربند ہوگیا اور جس کا نتیجہ آج اس کے سامنے ہے۔

معاشیات

انسانی آبادی جو پورے کرۂ ارض پر موجود ہے وہ معاشی اور اقتصادی بنیاد پر دو بڑے گروہوں میں تقسیم ہوگئی ہے۔ ایک لادینی یا سوشلسٹ نظام اور دوسرا مذہبی یا سرمایہ دارانہ نظام مگران دونوں کی بنیاد سیاستِ انسانیہ پر ہے۔

خالقِ کائنات نے اپنی تمام مخلوق میں اشتہا (بھوک) پیدا کرکے اور اسے قدم قدم پر محتاج بنا کر اپنے مخلوق ہونے اور اپنے خالق ورازق کی معرفت اور اطاعت حاصل کرنے کی ترغیب دی ہے۔ مگر سوائے انسان کے اس کی تمام مخلوق سیاستِ الٰہیہ کے تحت اپنے معاشی نظام کو بغیر کسی پریشانی کے باقی رکھے ہوئے ہے۔ اللہ نے ہر خطۂ ارض پر بسنے والی اپنی ہر مخلوق کے لئے اُسی جگہ ان کا ہر سامانِ معاش مہیا کردیا ہے۔ اور اُسے اس معاش کے حصول کا طریقہ بھی بتا دیا ہے۔ جو غذا اس کے لئے مفید ہے اُس کو بھی بتایا اور جو غذا اس کے لئے مضر ہے اُسے بھی بتادیا۔ اس کی تمام مخلوق سوائے انسان کے، اپنی ابتدائے خلقت سے، حصولِ معاش میں اُسی طریقہ پر کاربند ہے، جو اللہ نے اس کے لئے مقرر کیا ہے۔

اُس نے انسان میں بھی اشتہا پیدا کی۔ اور صرف اشتہائے معدہ ہی نہیں بلکہ ہر عضو بدن اور ہر موئے جسم اور تمام حواس ظاہری اور باطنی کی بھی اشتہا پیدا کرکے ان کے رزق کا سامان بھی بہم پہنچایا ہے۔ اس نے تمام اغذیہ جسم وروح کا پورا پورا سامان اسی زمین پر مہیا کردیا ہے۔ یہاں عنوانِ کتاب کے تحت صرف دو قسم کی اشتہا کا ہی تذکرہ کیا جاتا ہے۔ ان میں سے ایک اشتہائے معدہ ہے اور دوسری اشتہائے نفس۔ معدہ کو اس کی غذا ملنے سے بقائے حیاتِ ظاہری ہوتی ہے۔ یعنی انسان چلتا پھرتا اور کام کاج کرتا دکھائی دیتا ہے۔ نفس کو اس کی غذا ملنے سے بقائے نسل ہوتی ہے یعنی سلسلۂ تولید وتناسل چلتا ہے۔ خالقِ کائنات کی تمام ذی حیات مخلوق جو کرۂ ارض پر بستی ہے

اُس میں بھی ایک اصول کارفرما ہے۔ اس نے یہ زمین اپنی تمام مخلوق کے لئے پیدا کی، اسی زمین میں اُس کی ابتدائے تخلیق سے اس کے اختتام تک اس کا سارا سامان معاش بھی مہیا کر دیا ہے۔ چنانچہ انسان کی ہی مثال لے لیجئے۔ بچے کی پیدائش سے قبل ماں کے پستانوں میں دودھ اتار کر اپنی رزاقیت کا ثبوت دیا۔ اور پھر آخر عمر تک اُسے غذا پہنچانے کے اسباب بھی مقرر کر دیئے، ان کے حصول کا طریقہ بھی اپنے مقرر کردہ ہادیوں کے ذریعہ بتا دیا۔ استعمال میں آنے والی مفید اور مُضر (حلال و حرام) چیزیں بھی اسے بتا دیں اور اجتماعی حیات کی تمام ضرورتوں کے پورا ہونے کے لئے اس نے چار اصول مقرر کر دیئے جو معاشیات اور اقتصادیات کے بنیادی اصول ہیں جو یہ ہیں۔

(۱) زمین، سرمایہ اور محنت (افرادی قوت) کا صحیح امتزاج۔

(۲) طلب و رسد کا متوازن ہونا۔

(۳) مندرجہ بالا دونوں چیزوں کا انحصار نظام تعلیم کے صحیح خطوط پر متعین ہونے پر ہے۔

(۴) اور ان تینوں کی بنیاد حاکمیتِ الٰہی کے تحت انفرادی اور اجتماعی نظامِ حیات کو استوار کرنے پر ہے۔

مگر انسان نے حاکمیتِ الٰہی کے بجائے انسانی اقتدار کے تحت اپنے سیاسی نظام کی طرح اپنے معاشی نظام کو بھی خود ہی مقرر و متعین کرنا شروع کر دیا۔

موجودہ دور کے مغربی اقوام کے مفکرین اور ماہرینِ معاشیات نے اپنی ضخیم کتابوں کے ذریعہ اس موضوع پر قلم فرسائی کرتے ہوئے اور اپنی آرار کا اظہار کرتے ہوئے پوری نسلِ انسانی کے معاشی اور اقتصادی مسائل کا حل بالآخر خاندانی منصوبہ بندی یعنی نسل کشی کے ذریعہ تولید نسل کو روکنا قرار دیا ہے۔

ان نام نہاد مذہب کے ٹھیکیداروں، اور خدا کے وجود کے اپنے طور پر قائل انسانوں کی، اپنے نظام سے منسلک افراد کے معاشی اور اقتصادی مسائل کے حل کی ناکامی کے بعد، خُدا کے وجود کے مُنکر، اور مذہب بیزار انسانوں نے، شعوری یا لاشعوری طور سے معاشیات کے اوّل الذکر تین اسلامی اصولوں پر سیاستِ انسانیہ کے تحت اپنے معاشی نظام کو استوار کیا اور اس کو لادینی نظام یا سوشلسٹ نظام کے نام سے دنیا کو روشناس کرایا۔ انہوں نے اس نظام سے منسلک تمام افراد کو روٹی، کپڑا، مکان کے علاوہ اُن کی اور دوسری بنیادی ضروریات کو پورا کر کے اُن کے

معاشی اور اقتصادی مسائل کو تو حل کر دیا۔ لیکن اس کے عوض ان کی فکر و نظر کی آزادی، اور اُن کی محنت کی کمائی پر ان کے حق تصرّف کو سلب کر لیا۔ اور ان کو ذہنی طور سے مفلوج کر کے، انہیں ایک ایسی مشین بنا دیا جس کا ڈرائیور اس کو جس طرح چاہے استعمال کرے۔ لیکن ضمیر اور فکر و نظر پر اس سخت پابندی کی وجہ سے ان میں اس نظام کے خلاف جذبۂ بغاوت پرورش پانا ایک فطری امر ہے اور یہ ایک ایسا آتش فشاں ہے جو کسی وقت بھی لاوا اُگل سکتا ہے۔ اس کے علاوہ خود حکمران طبقہ میں کشمکشِ اقتدار کا پیدا ہونا بھی لازمی ہے جس کے مظاہرے ان سوشلسٹ ممالک میں بھی اکثر ہوتے رہتے ہیں۔ پس ثابت ہوا کہ اجتماعی حیات کا جو نظام بھی خواہ وہ سیاسی ہو یا معاشی سیاست میں شخصی ہو یا جمہوری۔ جمہوری میں صدارتی ہو یا پارلیمانی، وحدانی ہو یا وفاقی اور شخصی میں ایک آدمی کی آمریت ہو یا پارٹی کی۔ غرض کہ کوئی بھی صورت ہو، جب تک حاکمیتِ الٰہی کی فطری بنیاد پر قائم نہیں ہو گا یقینی طور سے ناکام ہو جائے گا۔ بقولے۔

خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

مذہب انسان اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا سفر جس اصول کے تحت طے کرتا ہے وہ اس کا مذہب کہلاتا ہے۔ اور یوں لامذہبیت نے بھی ایک مذہب کی شکل اختیار کر لی ہے۔

خالقِ کائنات نے اپنی مخلوق انسان کو جس طریقۂ زندگی کے اختیار کرنے کی تلقین کی تھی اس کا نام اُس نے دینِ اسلام رکھا تھا اور یہ دین خلقتِ آدمؑ کے وقت سے ہی ہے اور اللہ کا پسندیدہ دین ہے۔ اللہ کے مقرر کردہ ہادیوں نے، انسانوں کو اسی دین کے اختیار کرنے کی ہدایت کی، اسی طریقۂ زندگی کو اختیار کرنے کا ایک نام صراطِ مستقیم بھی ہے۔ اُس کے تمام ہادی اسی صراطِ مستقیم پر تھے۔ اس نے خصوصی طور سے ہادیٔ اعظم ختمی مرتبت کو سورۂ یٰسین میں مخاطب کر کے کہا ہ یٰسین ------- علیٰ صراط مستقیم

ترجمہ: اے سین (سید و سردار) اس حکمت والے قرآن کی قسم، بے شک تو مرسلین میں سے ہے اور (دین کے) بالکل سیدھے راستہ پر (ثابت قدم) ہے۔

تشریح :- ختم المرسلین سے قبل بھی جو انبیاء و رسول دائمہ انسانوں کی ہدایت کے لئے بھیجے گئے تھے وہ ان آیات کی رُو سے صراطِ مستقیم پر تھے، اور اللہ کے انعام یافتہ بندے تھے۔ بعد ختمی مرتبت صرف وہ لوگ ہی انعام یافتہ ہوئے جو رسول مقبول کے قدم بہ قدم چلے، جنہوں نے کسی مرحلہ پر رسول اللہ کی نافرمانی نہیں کی، جو صدیقین کی منزل پر ہیں جو شہداء کے درجہ پر ہیں اور جو صالحین کی صف میں ہیں۔

اللہ نے پورے قرآن کا خلاصہ سورۂ الحمد میں بیان کر دیا ہے۔ اور اس سورہ کو اتنی اہمیت دی ہے کہ ہر نماز کی ہر رکعت میں اس کا پڑھنا لازمی اور شادی و غم کے موقعوں پر اس کی تلاوت ضروری قرار دی ہے، اس سورہ میں کل سات آیات ہیں۔ پہلی تین آیات میں اس نے اپنے خالق و رازق، رحمان و رحیم اور حاکم حقیقی ہونے کا ذکر کیا ہے۔ چوتھی آیت میں بندوں سے اُن کی بندگی کا، خود ان کے ہی منہ سے اقرار کراتے ہوئے اللہ کے علاوہ کسی اور سے مدد نہ مانگنے کا اقرار لیا ہے۔ پانچویں آیت میں اس نے بندوں سے یہ اقرار کرایا ہے کہ ہدایت صرف اللہ کی طرف سے ہے اس کے علاوہ کسی کو بھی ہادی مقرر کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ کیونکہ جب بندہ کہتا ہے کہ اھدنا الصراط المستقیم یعنی ہمیں صراط مستقیم کی ہدایت کر تو اس کا یہی مطلب ہوتا ہے کہ اللہ ہی کو اختیار ہے کہ وہ بندوں کی ہدایت کے لئے ہادی مقرر کرے۔ چھٹی آیت میں اُن انعام یافتہ بندوں کا ذکر ہے جو خود صراطِ مستقیم پر ہیں اور جن کے نقش قدم پر چلنے اور ان کا اتباع کرنے کا انسان خود اپنی زبان سے آرزومند ہے۔ ساتویں آیت میں بندہ اللہ کے مغضوب اور گمراہ افراد کے طریقۂ زندگی کو بسر کرنے سے بچنے اور اس سے کنارہ کش رہنے کی تمنا بھی اپنی ہی زبان سے کر رہا ہے۔

تو اس طرح مذہب اسلام یا دینِ اسلام کا خلاصہ یہ ہوا

کہ انسان حاکمیتِ الٰہی کے تحت اپنے انفرادی اور اجتماعی نظامِ حیات کو اس طرح بسر کرے جس طرح اللہ کے مقرر کئے ہوئے معلم اُس کو بتائیں۔ نظریاتی طور سے یہ معلم جو تعلیم دیں اس کو عقل کی کسوٹی پر پرکھ کر قبول کرے اور عملی طور سے جیسا یہ معلم عمل کریں خود بھی ویسا ہی عمل کرے۔ مگر چونکہ انسانوں کی اکثریت نے ان معلموں کی نظریاتی اور عملی تعلیم سے ہٹ کر تھوڑے تھوڑے فرق کے ساتھ اپنا طریقۂ حیات تبدیل کرنا شروع کر دیا جس کے کچھ عرصہ بعد دینِ اسلام کے علاوہ اور

دوسرے مذاہب وادیان کا نام اختیار کرلیا اور پھر ان مذاہب میں بھی سینکڑوں فرقے وجود میں آتے رہے۔ حتیٰ کہ انسانوں کی ایک کثیر تعداد نے سرے سے کسی دین کو ہی ماننے سے انکار کردیا۔ اگرچہ بظاہر یہ لوگ خدا کے منکر ہوکر اپنے آپ کو لامذہب کہلواتے ہیں لیکن درحقیقت وہ جس طریقۂ زندگی کو بھی اپنائیں گے وہ ان کا مذہب کہلائے گا کیونکہ وہ اپنا سفرِ حیات، اپنے مقرر کئے ہوئے کسی نہ کسی رہبر کی ہدایت کے تحت ضرور طے کریں گے۔ قرآنِ مجید سورۂ قصص کی آیت ۴۱ میں انسانوں کے بنائے ہوئے ایسے رہبروں کی نشاندہی ان الفاظ میں کررہا ہے۔ ٥ وَجعلنا ھم ------ ینصرون ٥

ترجمہ:۔ اور ہم نے اُن کو (گمراہوں کا) پیشوا قرار دے دیا کہ (انسانوں کو) آگ کی طرف بلاتے ہیں۔ اور قیامت کے دن انھیں کسی طرح کی مدد نہ دی جائے گی۔

لہذا ہر وہ انسان جو عقلِ سلیم کا مالک ہے وہ دونوں راستوں میں سے کسی بھی راستہ پر چلنے کا مختار ومجاز ہے اور اس پر کوئی جبر اللہ کی طرف سے نہیں ہے، لیکن سیاستِ الٰہیہ کے تحت سفرِ حیات طے کرنے میں فلاحِ دارین ہے۔ اور سیاستِ انسانیہ کے تحت زندگی گزارنے میں خسرِ الدنیا والاخرۃ ہے۔

تمام انسانوں کے لئے دعوتِ الی الحق کل بھی تھی اور آج بھی ہے لیکن کل ـــــ ـــ؟

صرف یومِ حساب ہوگا

وما علینا الا البلاغ

ادارہ

کراچی